

تو کیا جانے دل کا درد

نازیہ کنول نازی



”ٹوکیا جانے دل کا درد“

”ٹوکیا جانے دل کا درد“ یہ ناول ادبی دنیا میں میرے ابتدائی سفر کے ناولز میں سے ایک ہے۔ 2005ء میں ماہنامہ حناء ڈائجسٹ میں پانچ اقساط میں شائع ہونے والے اس ناول کو قاری بہنوں کی بڑی تعداد کی پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اپنی اشاعت کے بعد بھی یہ ناول قاری بہنوں کو اپنے حصار میں جکڑے رہا تھا۔

اپنے تھرڈ ایئر کے Exams کی وجہ سے میں نے جب صرف پانچ قسطوں میں اس ناول کا اختتام کیا، تو ملک بھر سے بہنوں نے کال کر کر کے میرے اس فیصلے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور تاحال (جبکہ اس ناول کی اشاعت کو پورے پانچ سال گزر چکے ہیں) اس ناول کے کچھ واقعات کو دوبارہ تحریر کرنے کا اُن کا اصرار جاری رہا، جس کی وجہ سے اس ناول کے ایک حصے کو مناسب تبدیلیوں کے ساتھ مجھے اپنے نیو سلسلہ وار ناول ”پتھروں کی پلکوں پر“ میں شامل کرنا پڑا۔

وطن عزیز کے ساتھ ساتھ پڑوسی ملک بھارت میں بھی قارئین کی ایک بڑی تعداد کی پسندیدگی سمیت میرا یہ ناول بھی انشاء اللہ جلد آپ کی خدمت میں پیش کرونگی، فی الحال کہنا صرف یہی ہے کہ کتاب کے قارئین کی رائے، ڈائجسٹ کے قارئین سے اتفاق کرے یہ ضروری نہیں، نازیہ کے لئے جتنی اہمیت اُس کے ڈائجسٹ کے قارئین کی ہے اتنی ہی اہمیت اُس کے کتاب کے قارئین کی بھی ہے لہذا میرے ابتدائی ناول کو، آپ کی کیا رائے ملتی ہے، مجھے اس کا انتظار رہے گا آخر میں گل فراز احمد بھائی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ جن کی بے لوث محبت اور کاوش نے، میری تحریر بھی آپ تک پہنچانے کیلئے خوبصورت پلیٹ فارم مہیا کیا۔

آپ سب کی محبتوں اور دعاؤں کی خواستگار

”نازیہ کنول نازیہ“

شخص بھی شاید ایسا نہ کر پائے گا۔

صاحبان۔

تحفظ نباتات۔ تحفظ حیوانات، تحفظ نادرات، تحفظ معاشرت و اخلاقیات جیسے ادارے تو وجود پذیر ہوئے۔

مگر تحفظ احساسات، التفات اور الفاظ کا ادارہ دراصل نازیہ کنول نازی کے جشہ میں ہی تکمیل پاتا نظر آتا ہے۔

دعا ہی دے سکتا ہوں کہ اور زور قلم پیدا ہو۔

گلزار احمد صابر

ڈپٹی ڈسٹرکٹ پبلک پرائیسیوٹر
ہارون آباد

”پاراپارامحبتوں کی متلاشی نازیہ کنول نازی“

دور حاضر میں ہلکتی سسکتی غموں سے چور زندگی آسانٹوں کی راہیں ڈھونڈتی ہے۔
کچھ چین ہیں کہ ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں محبتیں ہیں کہ ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ پیار و محبت کے
جذبات نفرت و حقارت میں بدلتے چلے گئے ہیں۔

فطرت نے دل کو جذبات کا آئینہ دار نہیں بنایا تھا اس میں تو محبت کوٹ کوٹ کر
بھری تھی۔ مظاہرات فطرت محبت کے بل بوتے پر ہی فضاؤں میں رنگینی اور ہوش ربا موسیقی
بھرتے ہیں۔

کبھی درختوں کی شاخوں کے جھولنے سے۔ کبھی پھول کی خوشبو کے پھیلنے سے۔ کبھی
باد صبا کی خنکی سے۔ کبھی قوس قزح کے رنگوں سے دنیا حسین نظر آتی ہے۔

مگر یہی فطرت کا حسن جب انسان کے اندر سما جاتا ہے
تو نازیہ کنول نازی بنتی ہے۔

جس کے وجود میں جس کے جذبوں میں۔ جس کے لفظوں میں۔ جس کے اشعار
میں۔ جس کے افکار میں۔ جس کے کردار میں رنگوں ہاں ہاں محبت کے رنگوں کی دھنک دور تک
پھیلتی نظر آتی ہے۔

جو بکھری ہوئی پارہ پارہ محبتوں کو ڈھونڈتی ہوئی لفظوں غزلوں افسانوں میں ساتی نظر
آتی ہے۔

سرزمین جنوبی پنجاب کی تاریخ جب رقم کی جائے گی۔ جب بھی افسانہ پڑھا جائیگا۔
جب بھی اشعار پر بحث ہوگی تو نازیہ کنول نازی صاحبہ کا نام ضرور موقع بحث بنے گا۔ اس خطہ
محبت و سرشاری سے ابھرتی ہوئی نازیہ کی تحریریں ادب میں ایک منفرد مقام ضرور پائیں گی۔
نازیہ کی تحریریں اور دل کو چھو لینے والے اشعار پڑھ کر داد نہ دینا علمی و ادبی بددیانتی
کے علاوہ اخلاقی دیوالیہ پن اور تعصب ہوگا۔ جو قلم اور افکار کی حرمت پر یقین رکھنے والا کوئی

”میری وکھری نازیہ“

نازیہ کنول نازی بی بی تم نے فرمائش کر کے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے، سوچتی ہوں تمہارے لئے کیا لکھوں۔ تم تو میری اپنی ہو اور تمہاری اپنائیت ہی نے میرے قلم کا راستہ روک رکھا ہے۔ سوچتی ہوں تمہارے لئے جو کچھ بھی لکھوں گی وہ کم ہی ہو گا تم تو میرے دل میں کسی دھڑکن کی طرح بستی ہو۔ بہر حال تمہاری فرمائش تو پوری کرنا ہی ہے۔

نازیہ کنول نازی کا نام اب اٹھانا نہیں رہا۔ خصوصاً ڈائجسٹ پڑھنے والی بہنوں کے لئے نظم ہو کہ نثر دونوں اصنافِ سخن میں نازیہ کا قلم یکساں رواں ہے۔ ان کی نثر دلوں کو چھونے والی ہوتی ہے اور شاعری میں انہیں یہ بلکہ حاصل ہے کہ اپنے خواب جاگتی آنکھوں میں منتقل کر دیتی ہیں۔ لفظوں کی جادوگری انہیں خوب آتی ہے۔ اپنی بات صرف قاری تک پہنچانا ہی نہیں جانتیں بلکہ ان کے دلوں میں اتر جانے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی نظمیں غزلیں سر راہ رکھے چراغوں کی طرح راستے روشن ہی نہیں کرتیں مسافر کو منزل کی سمت کا پیہ بھی دیتی نظر آتی ہیں۔ نازیہ کنول نازی کا شعری مجموعہ ”تہا چاند میرے سامنے ہے“ میں نے شروع تا آخر پڑھا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ چندا کی چاندنی اور لودیتی تنہائی کے احساس کو خوبصورت پیرائے میں اپنے جذبات کی سچائی سے چاندنی کے رنگ میں رنگ کر نکھار دیا گیا ہے جب کوئی شاعرہ اپنے جذبات کو سچ کی مہندی سے سجاتی سنوارتی ہے تو اس کا سچ لفظوں کی آج پر کندن بن جاتا ہے اور پڑھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود اس کے جذبات کو الفاظ کا پہناو امل گیا ہو پھر اسے ہر بات اپنی محسوس ہوتی ہے اور یہ تاثر نازیہ کنول نازی بڑے ناز، انداز اور اداسے اپنے شعری مجموعے میں یک جا کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ وہ اپنے جذبے سے اپنے احساس اور تخیل کو بھرپور انداز میں اپنے قاری تک پہنچانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ نازیہ کی تحریر میں سادگی ہے، سلاست و روانی ہے اور پرکاری کا ذائقہ بھی ملتا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ آمین

تمہاری اپنی

فرحت آراء

میری بے لوث محبت کے گواہ چاند بتا
میں نے ہر روز اسے یاد کیا ہے کہ نہیں
وہ جو مصروف ہے، مشہور ہے لوگوں کے لئے
دل یہ اس کے لئے آباد کیا ہے یا نہیں
میری بے لوث محبت کے گواہ چاند بتا
میں نے ہر روز دعاؤں کے مہکتے گجرے
جھلملاتی ہوئی آنکھوں کے نکھرتے آنسو
گدگداتے ہوئے احساس کے پیار کی خوشبو
اس کے کوچے کی طرف روز پہنچائی کہ نہیں
میری بے لوث محبت کے گواہ چاند بتا
ٹہل کر دیر تلک رات کی تنہائی میں
دل کی گہرائیوں سے میں نے اسے سوچا کہ نہیں
سرسراتی ہوئی سر مست ہواؤں کی قسم
کھا کے بتلاؤ اسے ٹوٹ کے چاہا کہ نہیں
تیری ہی چاندنی میں لاکھ ستاروں کے تے، میں نے پیغامِ وفا اسے بھیجا کہ نہیں
میری بے لوث محبت کے گواہ چاند بتا
جس طرح رہ گئی صحراؤں میں رل کر سی
میں نے حق پیار کا اس طرح نبھایا کہ نہیں
جس طرح کھائے تھے لیلیٰ نے جگر پر پتھر

میں نے بھی دیپ محبت کا جلایا کہ نہیں
پھر بھی وہ مجھ سے خفا ہے تو گلہ کس سے کروں
تو ہی ہراز ہے میں اور گواہ کس کو کروں
ہے کیا سچائی، اسے کون بتائے گا بھلا
میری بے لوث محبت کے گواہ چاہتا

رات بھر..... گہری نیند میں مدھوش رہنے کے بعد، صبح جب چڑیوں کی چہچہاہٹ
سے اس کی آنکھ کھلی تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سو بے ہوئے پوٹوں اور معطل
حواس نے اس کی حالت خاصی قابل رحم بنا رکھی تھی۔ پہلی فرصت میں تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں
آیا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے؟

تاہم کچھ ہی لمحوں کے بعد جب اس کے منتشر حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو اسے
یاد آیا کہ وہ کل یونیورسٹی سے گھر واپس آتے ہوئے کڈ نیپ ہو گئی ہے، مگر کیوں.....؟

”میں نے تو کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ کوئی مجھے اپنے انتقام کی بھیٹ چڑھانے کے
لئے ایسا قدم اٹھائے، میرے بابا کرٹل خالد شاہ رحمانی، جنہیں شہر کی معزز شخصیت ہونے کا
اعزاز حاصل ہے، وہ بھی کسی کے دشمن نہیں، ہمیشہ اپنے پرانے کے آنسو پونچھتے ہیں انہوں
نے، کبھی کسی سے عداوت نہیں رکھی۔ اور..... اور میرے بھیا ذیشان رحمانی..... انہیں تو اپنے
برزنس سے ہٹ کر، کسی اور طرف توجہ دینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔ پھر..... پھر میں یہاں کیوں
لائی گئی ہوں..... ک..... کہیں کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر تو نہیں.....“ بری طرح چکراتے سر کو
دونوں ہاتھوں میں تھام کر، بل دوپل کے لئے اُس نے سوچا تھا۔

”اف..... میرے گھر واپس نہ لوٹنے پر پاپا کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اور..... اور ذیشان
بھائی..... وہ بھی میری وجہ سے کتنے ڈیپریس ہوئے ہوں گے..... کیسے سنبھالا ہوگا انہوں نے
پاپا کو؟ کیسے تسلی دی ہوگی انہیں.....؟ جب کہ وہ تو خود آج کل بے حد ڈیپریس دیکھائی دیتے
ہیں..... او مائی گاڈ، میں کیا کروں.....“

سوچوں کی یلغار نے اس پر اپنا گھیراؤ تنگ کیا ہوا تھا۔ اور وہ بے بسی کے شدید
احساس میں گہری سسک پڑی تھی۔ صبح کے ٹکجے سے دھندلے اب چھٹنے لگے تھے۔ باہر سرسبز
درختوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی جنگل یا فارم ہاؤس وغیرہ کے
قریب لاکر مقید کی گئی ہے۔

اسے آنسوؤں سے فرصت ملی تو بمشکل اپنے پر تھکن وجود کو گھسیٹتی وہ کمرے میں لگی
واحد کھڑکی کی طرف لپک آئی، باہر دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا دیکھائی دے رہا تھا۔ قطار در قطار لگے
درختوں کا ذخیرہ اور ان پر چہچہاتے پرندے ماحول میں فرحت کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ قریب و
جوار میں کسی اور بلڈنگ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ کسی فارم ہاؤس کا ہی ایک حصہ تھا۔

وقت کی گرفت سے جسے جیسے جیسے لمحے چھوٹتے جا رہے تھے۔ اسے گھٹن کا احساس
ہونے لگا تھا۔ دماغ کی شریانیں جیسے پھٹنے کو تیار ہو گئی تھیں، تبھی دھاڑ سے کمرے کا دروازہ
کھلا اور کوئی انتہائی خطرناک تیوروں کے ساتھ، سرخ انگارہ آنکھیں لئے، اس کی سمت بڑھ آیا۔
سبعین کے لئے چہرہ قطعی اجنبی تھا، تاہم پھر بھی وہ اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی تھی۔ تبھی وہ اس
کے قریب پہنچا اور ایک زبردست تمانچہ، اس کے نازک گال پر رسید کرتے ہوئے غرا کر بولا۔

”ذلیل عورت..... میرے گھر میں اس وقت زلزلہ آیا ہوا ہے۔ میرے ڈیڈ.....
آئی۔ سی۔ یو میں ہیں، اور یہ سب تمہارے اس کینے بھائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ جو میری بہن کو،
عین اس کے نکاح کے روز، ورغلا کر نجانے کہاں لے بھاگا ہے۔ لیکن یاد رکھو، اگر تمہارے اس
کینے بھائی کی اس گھٹیا حرکت کے باعث، میرے ڈیڈی کو کچھ ہوا۔ تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا
کہ آئندہ آنے والی سات نسلیں بھی تمہارے انجام سے پناہ مانگیں گی.....“

سرخ انگارہ آنکھوں میں جتنی تپش تھی، اس سے کہیں بڑھ کر اس کا لہجہ سنگ رہا تھا۔
ایک بل کے لئے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ تاہم پھر اس کے الفاظ کا مفہوم
کھلا تو وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی۔ حواس تو اس کے پہلے ہی معطل تھے، اوپر سے اس کا زوردار چائنا،
اس کے چودہ طبق روشن کر گیا تھا، اور اب اس کا یہ گھٹیا الزام..... وہ تڑپ کر ہی تو رہ گئی تھی۔

”شٹ اپ..... خبردار جو تم نے میرے بھیا کے شفاف کردار پر کیچڑ اچھالنے کی
کوشش کی..... میرے بھیا عورتوں کی بے حد عزت کرتے ہیں..... وہ ایسا کرنا تو درکنار، ایسا
سوچ بھی نہیں سکتے.....“

تھپڑ کی شدت کے باعث اس کا ہونٹ زخمی ہو گیا تھا، جسے بائیں ہاتھ سے رگڑتے
ہوئے وہ چلا اٹھی تھی۔

تبھی اس کے سامنے اس خوبرو سے نوجوان کا ہاتھ، پھر فضا میں بلند ہوا اور سبعین
کے چہرے پر اپنی انگلیوں کے نشان باقی چھوڑ گیا تھا۔

”نی الحال خدا سے میرے پاپا کی زندگی کی دعائیں مانگو، کیونکہ جب تک وہ

اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں کیا دکھ ہے؟

”یا خدا..... اس بد بخت سنی استاد کو عارت کر دے، اس نے پوری بستی کا چین حرام کیا ہوا ہے.....“ زلیخا بیگم کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں جھولی پھیلائے کسی کو بددعائیں دے رہی تھیں جب انزلہ نے ان کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ انزلہ کو دیکھ کر ان کی پر غم نگاہوں میں، ایک دم سے روشنی کی جوت بڑھی تھی، اور انہوں نے سرعت سے، اپنی آنکھیں رگڑ کر اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔

”آگئی میری دھی، پورے پندرہ دنوں سے رستہ دیکھ رہی ہوں تیرا، مگر تجھے آج اپنی داوی کا گھر یاد آیا ہے۔“

اس کی پیشانی چومتے ہوئے بھی، وہ اس سے گلہ کرنا نہیں بھولی تھیں، تبھی وہ اپنی چادر طے کرتے ہوئے، دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

”مما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، بڑی ماں اسی لئے میں آپ کو اطلاع کر کے فوراً نہیں آسکی.....“

”اچھا..... کیا ہوا ہے فریخہ کو..... زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے ناں۔“ پل بھر میں ان کے بوڑھے چہرے پر فکر کی لہریں بچھ گئی تھیں۔ لہذا وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے بولی۔

”ارے نہیں بڑی ماں، ایسی کوئی بات نہیں، بس یونہی ذرا سانس پھر چھو گیا تھا، اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے اور پھر حسن بھائی ہیں ناں ان کے پاس، ان کا خیال رکھنے کے لئے..... آپ پریشان نہ ہوں.....“

”ارے کیسے نہ پریشان ہوں بیٹی..... میری جان تو تم لوگوں میں انکی رہتی ہے، خیر تو لمبے سفر سے آئی ہے رستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں.....؟“

نجانے کس فکر کے پیش نظر انہوں نے فوراً آنکھیں سیڑ کر پوچھا تھا، جب وہ پھر سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں بڑی ماں، مجھے قطعی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہاں ملتان سے حسن بھائی نے ٹرین میں بٹھا دیا تھا اور یہاں میری دوست کے بھائی نے ہمیں رسیو کر کے باحفاظت گاؤں تک پہنچا دیا.....“

”چلو شکر ہے اللہ کی پاک ذات کا، تو ایسے کر، لمبے سفر سے آئی ہے، تھوڑی دیر کو

سلامت ہیں، میں تم سے انسانوں والا سلوک کر رہا ہوں۔ خدا نخواستہ، انہیں کچھ ہو گیا، تو دیکھنا کہ میں کیسے تمہیں اس ذلیل شخص کے لئے عبرت بناتا ہوں، جو ہماری عزت کے ساتھ کھیل کر ہمارے گھر کو ویرانہ بنا گیا ہے.....“

لفظ لفظ میں آگ برس رہی تھی۔ وہ اس وقت اتنا ڈیپریس لگ رہا تھا کہ سبعین چاہنے کے باوجود، خود کو اس کی طرف دیکھنے سے نہیں روک پائی۔ خون چھلکاتی غلائی آنکھیں اور تنے ہوئے اعصاب، اس کے اندر کا حال بخوبی عیاں کر رہے تھے۔ تبھی اس کے موبائل پر بیل ہوئی، تو وہ انتہائی کڑنگی کے ساتھ اسے، پرے دھکیل کر، اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہیلو شازل علی شاہ سپیکنگ.....“ موبائل آن کر کے وہ اس کی طرف سے اپنا رخ پھیر گیا تھا۔

”وہاٹ..... م..... میں ابھی پہنچتا ہوں.....“

دوسری جانب سے نجانے کیا کہا تھا کہ اس کی کشادہ پیشانی کی شکنیں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ تبھی وہ ایک مرتبہ پھر، جارحانہ تیور لئے اس کی سمت پلٹا، اور اس کے لمبے ریشمی بالوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

”میرے ڈیڈ کی حالت پھر سے بہت سیریس ہو گئی ہے، یاد رکھنا، اگر انہیں کچھ ہوا تو میں تم سے وہ انتقام لوں گا کہ خود تمہارے اس لوفر بھائی اور بوڑھے باپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی.....“

اس وقت اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ سبعین کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں واضح سننا ہٹ ریگتی محسوس ہو رہی تھی، تاہم اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتی، وہ اسے بے دردی سے پیچھے دھکیلتے ہوئے، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آہ..... پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر

دکھ عبارت تو نہیں ہے کہ تجھے لکھ بھیجیں

یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو

نہ کوئی بات ہے ایسی کہ بتائیں تجھ کو

زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دے

آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو

آرام کر لے تب تک میں عصر کی نماز سے فارغ ہو جاؤں، پھر تیرے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں، تب تک شاید تیرے بڑے ابا بھی گھر لوٹ آئیں.....“

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر، انہوں نے حکم دیا تو انزلہ دھیسے سے اثبات میں سر ہلا کر، اپنا سامان اٹھاتے ہوئے سامنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جھکن تو واقعی اس وقت اسے بہت زیادہ ہو رہی تھی۔

پھر عشاء کے قریب جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر، باہر صحن کی جانب قدم بڑھائے تو دادا ابا کی آواز سن کر ٹھٹھکی گئی۔ غالباً نہیں یقیناً وہ انتہائی ٹھکر کے ساتھ دادی اماں سے کہہ رہے تھے۔

”تو کل ہی انزلہ بیٹی کو واپس بھجوادے نور بھری، مجھے اس کی رسوائی گوارہ نہیں ہے۔ پھر سنی استاد کو تو، تو بھی جانتی ہے، کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ کتنا ظالم ہے، ہم اپنے مفاد کے لئے اپنی بیٹی کی عزت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے.....“

”میرا بھی یہی خیال ہے بھر جائی.....؟“

چولہے کے پاس، کریم بخش کے ساتھ ہی پیڑھی سنبھالتے ہوئے انہوں نے دادی ماں کو مخاطب کیا تھا، تو وہ چولہے پر توار کھتے ہوئے افسردگی سے بولیں۔

”ہم غریبوں کا کیا خیال ہوتا ہے بھائی، ہماری تو سانسوں پر بھی، اس کجخت سنی استاد کا پہرہ ہے، کب گھر میں گھس آئے، راہ روک لے کیا مانگ لے..... کچھ خبر نہیں.....“

”ہاں بھر جائی، کہتی تو تو ٹھیک ہی ہے، پتہ نہیں وہ انسان ہے یا حیوان، جو ہمارے آنسو، ہماری منت، ہماری مفلسی، کچھ بھی اثر نہیں کرتا اس پر، ابھی خدا بخش بتا رہا تھا کہ پرسوں مجید نے اسے ہتھ دینے سے معذوری ظاہر کر دی، تو اس پر وہ اسے گریبان سے پکڑ کر، گاؤں کے چوراہے پر لے آیا..... بہت مارا پیچا رہے کو، سارے گاؤں والے توبہ استغفار کرتے رہے، اب بھی حالت بڑی نازک ہے اس کی، مگر..... ہم بے بس غریب لوگ بھلا کیا کر سکتے ہیں اس کا، جب کہ اس کے آگے تو بڑے بڑے پولیس والے بھی پانی بھرتے دکھائی دیتے ہیں.....“

حقے کا گہرا کش لگا کر رشید چاچا نے انہیں مجید کے کی کہانی سنائی تھی۔ جس کا گھر اسی محلے کی آخری ٹکڑ پر تھا، تبھی اس نے ہلکی سی جھرجھری لی، تاہم سنی استاد کے بارے میں اس کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا۔

”پولیس والوں کی تو آپ نے خوب کئی رشید بھائی، کہنے کو عوام کے محافظ، قانون

کے رکھوالے، مگر اندر سے انسانیت کے دشمن، تھوڑے سے پیسے لے کر ایمان بیچ دینے والے بے ضمیر، بے درد انسان، بجائے اس کے کہ اس بد بخت کو نیکل ڈالیں اور ہماری دادری کریں، الٹا اسی کے حکم پر، ہماری جانوں کو عذاب میں ڈال دیتے ہیں، وہ خالہ نصیبین کے جوان بیٹے کا انجام کیا ہوا.....“ دادا جی خاموشی سے بیٹھے، حقے کے کش لگا رہے تھے اور دادی اب ایک کے بعد ایک روٹی پکا کر ان کے سامنے رکھ رہی تھیں، جب رشید چاچا نے، آہستہ سے اثبات میں گردن ہلا کر افسردہ لہجے میں کہا۔

”ہاں..... اس کا انجام کون بھول سکتا ہے بھر جائی، وہ تو شہزادہ تھا ہمارے گاؤں کا، مگر سنی استاد سے خواہ مخواہ الجھ کر، اپنی جان گنوا بیٹھا، کیا کرتا وہ، اس کی غیرت، اسے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر، خاموش تماشائی بننے کی اجازت نہیں دیتی تھی اسی لئے ہمیشہ کے لئے قبر کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔“ ”دہشت گرد“ کہلایا، ہاں..... اس معصوم کو تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ ”دہشت“ کیا ہوتی ہے، پھر بھی اسے زنجیروں میں جکڑ کر، پولیس مقابلے میں مرنا پڑا، کیا بھلا بھر جائی.....؟ کیا صلہ ملا اسے اپنی جان کی قربانی کا..... یہاں کسی نے بھی تو سنی دادا، کے خلاف گواہی نہیں دی، کسی نے بھی تو یہ نہیں کہا کہ وہ بے قصور تھا، امن اور محبت کا بیٹا مگر تھا، انصاف کی آواز کے لئے اٹھا تھا، گاؤں کے سکون اور راحت کے لئے، خالوں سے ٹکر لی تھی اس نے، کسی نے بھی تو نہیں کیا یہ.....“ رشید چاچا کی آواز قدرے بھگ گئی تھی، تبھی وہ جیسے چونک کر رہ گئی

”ک..... کہیں رشید چاچا، ایلان کی بات تو نہیں کر رہے، وہ..... وہ بھی تو اسی گاؤں میں آیا تھا، اور..... اور اس کی بھی تو صرف ایک ماں اور بہن تھی، نن، نہیں نہیں ایلان کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا، وہ..... وہ کبھی نہیں مر سکتا، اس اس کے لئے تو آئی ہوں میں یہاں..... اسے..... اسے کچھ نہیں ہو سکتا.....“ ہسٹریائی سوچوں سے سر جھٹک کر، دھڑ دھڑ کرتے دل کی منشر دھڑکنیں سنبھالے، وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ وہیں کمرے کی دہلیز کے پاس، زمین پر بیٹھ گئی۔

”بڑا سونہا پتر تھا نصیبین کا، تبھی تو اس کی موت کے بعد پاگل ہو گئی ہے بیچاری..... آہ بھر جائی..... پتہ نہیں انسان اپنے ہی جیسے بنی نوع انسان، کی جان کیسے لے لیتا ہے؟ جان سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں ہوتا، مگر بے بس انسان بھی بھلا کیا سکتا ہے.....؟“

دادی اماں یقیناً نصیبین کے جوان سالہ بیٹے کے لئے چپ چاپ آنسو بہا رہی تھیں،

جب رشید چاچا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے، مدہم لہجے میں کہا، جواب میں دادا نے، حقہ چھوڑ کر پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

”سن رشید، تیری ماشاء اللہ اس بار فصل بہت اچھی ہے، سنی استاد کو حصہ دے کر بھی کافی بچت ہو جائے گی، اگر تو اس بار نصیب کا کوٹھا پکا کر دے، تو بڑی دعائیں دے گی بیچاری، اس کا اب ہمارے سوا، اور ہے بھی کون.....؟“ داد کے پُرسوج لہجے میں، خالہ نصیب کے لئے بڑی ہمدردی تھی، تبھی رشید چاچا نے، فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاں کریم بخش، اس بار میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، خیر..... اللہ بہتر کرنے والا ہے، میں اب چلتا ہوں، تیری بھرجائی راہ دیکھ رہی ہوگی، پھر ساجد بھی پتہ نہیں گھر پہنچا ہے کہ نہیں.....“ تھوڑی ہی دیر میں رشید چاچا جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، تو ازلہ بھی لرزتے قدموں کو بمشکل گھسیٹی چارپائی تک چلی آئی، سینے میں سانس دھونکی کی مانند چل رہی تھی۔ دل کی دھڑکن معمول سے بڑھ کر تیز تھی۔ خوبو ایلان کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کس سے ایلان کے بارے میں پوچھے؟ کیسے رابطہ کرے اس سے، جب کہ گاؤں میں تاحال موبائل سنگل نہیں آیا تھا۔ سوچ سوچ کے اس کے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں، تبھی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرف اس کے ذہن میں لپکا، اور اس نے پھر قدم باہر صحن کی جانب بڑھا دیئے۔

☆☆☆

ہوا شہر فنا کے راستوں پر

چل پڑی ہے

ہمارے ہاتھ میں ہے ایک دیا امید کا روشن

سواب یہ دیکھنا ہے کہ

یہ تہا دیا

کب تک جلتا ہے

آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے اور وہ سسک رہی تھی۔

بار بار کرنل خالد شاہ رحمانی اور ذیشان رحمانی کے متفکر چہرے اس کی نگاہوں میں

گھوم رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ کل صبح کالج میں بھی کچھ کھانے

کو من نہ چاہا تو بھوکے پیٹ ہی واپسی کے لئے نکل آئی، مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ یوں اچانک

کڈ نیپ ہو جائے گی۔ اور کڈ نیپ کرنے والا اتنا بے رحم ہوگا کہ اسے اتنے گھنٹوں تک بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد بھی، پانی کے دو گھونٹ تک پینے کو نہیں دے گا، پیاس کی شدت کے باعث حلق میں جیسے کانٹے آئے تھے، مگر وہاں پورے کمرے میں دور دور تک کھانے پینے والی کسی چیز کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ مارے بے بسی کے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لب لب بھر آئیں۔

نجانے اسے ابھی کتنی دیر اس قید خانے میں مقید رہنا تھا، جب کہ اس وقت اسے کڈ نیپ ہوئے، پورے سولہ گھنٹے گزر گئے تھے، مگر اس بے رحم کا کہیں کچھ پتہ نہیں تھا، صبح سے رات ڈھلنے کو آ رہی تھی، اور رات میں انجینی جگہ پر تنہائی کے خوف سے، اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا، مگر وہاں اس کی داد رسی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

سلگتا، جھپٹتا ذہن ایک مرتبہ پھر، اپنے گھر والوں کے طرف لگ گیا۔ نجانے اس کی اتنی طویل غیر حاضری پر اس کے پاپا کا کیا حال ہوا ہوگا۔ وہ تو آل ریڈی دل کے مریض تھے۔ ماما کی رحلت کے بعد بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے جیسے، معمولی سا غم برداشت نہیں کر سکتے تھے، تبھی تو وہ اور ذیشان ان کا بے حد خیال رکھتے تھے، ہر ممکن طریقے سے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ گھر میں اگر، بچا کی فیملی کی جانب سے کوئی ٹینشن پیدا ہوتی تھی تو وہ دونوں مل کر، منٹوں میں اسے حل کر لیا کرتے تھے۔

حقیقت میں پاپا کے مہربان وجود کے سوا اب دنیا میں ان کا اور تھا ہی کون؟

ماما کی محبت بھری شخصیت سے محرومی تو محض گیارہ سال کی عمر میں ہی سہی پڑ گئی تھی اسے، تب سے اب تک پاپا کے پر شفیق وجود ہی نے، ان دونوں بہن بھائیوں کو، کسی قیمت آگینے کی طرح اپنی مہربان بانہوں کے حصار میں سمیٹ لیا تھا۔ حالانکہ، وہ ماما کے وجود کی کس قدر عادی تھی۔ روزانہ صبح ناشتے سے لے کر، سکول کی تیاری، ہوم ورک کرنے، اور رات کو ان سے لپٹ کر کہانی سنتے سنتے، نیند کی آرام دہ بانہوں میں جانے کی عادت تو اب اس قدر پختہ ہو چکی تھی اس میں کہ ماما کے جانے کے بعد مہینوں وہ خود کو سنبھال نہ سکی، حالانکہ پاپا اور اس سے فقط دو سال بڑے بھائی ذیشان رحمانی، نے کسی کالج کی گڑیا کی مانند ہمیشہ اس کا خیال رکھا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی ماما کو کبھی بھلا نہیں پائی تھی۔ اس کی زندگی میں جو ایک خلاء ماں کی جدائی سے پیدا ہوا گیا تھا، وہ پھر کبھی پُر نہ ہو سکا تھا۔ یہ مرہم بھی گھاؤ کو مندل کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔

رہ رہ کر اسے اپنے ماضی کے گزرے لمحے یاد آ رہے تھے اور وہ چپ چاپ آنسو

پھر اگلے ایک ہفتے تک تمہیں سوائے پانی کے اور کوئی چیز بھی کھانے پینے کو نہیں ملے گی۔ تم ہر روز، یہاں دن میں فارم پر، میرے گھوڑوں کے اصطبل کی صفائی کیا کرو گی، انہیں خوراک کھلایا کرو گی اور رات میں یہیں اسی کمرے میں اکیلی زمین پر ایک کونے میں بیٹھ کر رات بسر کیا کرو گی۔ اس دوران، اگر تم سے میرے کسی بھی حکم میں، ذرا سی کوتاہی ہوئی، تو میں ہرگز اپنے بیٹ سے تمہارے بدن کی کھال اتارنے میں، کسی قسم کی پک کا مظاہرہ نہیں کروں گا، جان لو، کہ یہ فارم شہر سے بہت دور، ویران علاقے میں ہے۔ یہاں تمہاری پکار سننے والا، خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اگر تم اپنی سلامتی چاہتی ہو تو جیسا میں کہوں، ہر پل ویسا ہی کرنا، بصورت دیگر انجام تو تمہیں معلوم ہی ہے.....“ اس کے سرد لہجے میں بھی شعلے لپک رہے تھے۔ تمہی وہ جیسے سسک کر رہ گئی۔

”خدا سے ڈرو شاہنشاہ علی شاہ، میرا گلہ گھونٹ کر میرے بھیا سے کہہ دو کہ تم نے ان سے اپنا انتقام لے لیا ہے.....“ اس کا لہجہ بھرا آیا تھا، جب کہ وہ ایک سرسری سی نگاہ اس کی متورم آنکھوں پر ڈالتے ہوئے طنزیہ سی ہنسی ہنس دیا۔

”اتنی سستی موت نہیں دوں گا تمہیں سبعین الہدی، تمہیں تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے، اس آگ کو بجھانا ہے جو تمہارے بھائی نے میرے اندر بھڑکائی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی پیش قدمی کرنا، سبعین الہدی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

☆☆☆

تمہیں معلوم ہے ہم نے
کسی کے حجر میں یہ زندگی کیسے گزاری ہے
ہر اک خوشبو کی آہٹ پر
گماں اس کا گزرتا تھا
ہر اک ساعت یہ دل آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتا تھا
کئی پہلو بدلتی ساعتیں، ہاتھوں کو پھیلائے
دعائیں مانگتی اور ہانپتی دل سے گزرتی تھیں
مگر جو ہجر لاحق ہے
وہ جسم و جان کی دیواریں گراتا ہے
امید و بیم کی آنکھوں سے بینائی کے سارے نظروں کو

بہاتے ہوئے دل ہی دل میں کڈنپیر کے والد کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی، جب ایک مرتبہ پھر دھاڑ سے دروازہ کھلا، اور اگلے ہی پل، وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا، کمرے میں داخل ہوا۔

شدت گریہ سے آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں، بھیگی پلکیں اس بات کی گواہ تھیں کہ یقیناً تھوڑی دیر پہلے تک وہ خوب رویا ہوگا، تاہم اس وقت اس کے چہرے پر ایسی خاموشی تھی، جیسے طوفان گزرنے کے بعد، اجڑی، ہوئی بستیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سبعین اس سے ریکویسٹ کرنا چاہتی تھی کہ وہ اے چھوڑ دے مگر اس وقت اس کے چہرے پر، اس قدر کڑنگی تھی، کہ وہ سہم کر مزید سمٹ گئی۔

سرخ سرخ جلتی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ نہیں پائی تھی، نتیجتاً وہ چیز کی پاکش میں دونوں ہاتھ گھسائے، مضطرب سا، دائیں طرف بنی کھڑکی کی جانب چلا آیا۔ بہت سے پل اسی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ اس دوران نہ تو سبعین، اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے کی جسارت کر پائی، اور نہ ہی اس نے زبان سے ایک حرف نکالا۔

م..... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، جو میری زندگی کو عبرت بنا رہے ہو تم، خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی، پلیز.....“ ڈیڈ بائی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے، وہ گڑگڑائی تھی، وہ اس کے ریشمی بالوں کو، انتہائی بے دردی سے مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا۔

”مت یہ ٹسوے بہا کر دکھاؤ مجھے، اب کوئی اثر نہیں ہونے والا مجھ پر، مر گیا ہے میرے اندر کا شریف انسان، اب تمہارے سامنے جو شخص کھڑا ہے۔ وہ ایک پتھر ہے۔ گونگا بہرا پتھر، سو جتنا اس پتھر سے سر پھوڑو گی، نقصان تمہارا ہی ہوگا، میں نے اور میرے ڈیڈ نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا تھا؟ کچھ نہیں ناں، مگر اس کے باوجود میں بل بل سلگ رہا ہوں، اور میرے ڈیڈ..... میرے ڈیڈ زندگی سے دور ہو گئے۔ دوسروں کے گھر کے چراغ بجھا کر، تم لوگ اپنے گھر میں اجالا کیسے کر سکتے ہو.....؟“

وہ واقعی اس وقت کوئی جنونی ہی لگ رہا تھا۔ مگر سبعین میں اس کے مزید ستم سہنے کی ہمت نہیں تھی، سواب کے وہ خاموش رہی۔

کمرے میں سردی کا احساس دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا اور اس کے پاس ایک گرم شال تک نہیں تھی۔

”کل صبح میں تمہاری کچھ ”قابل دید“ تصاویر تمہارے بھائی کو سکین کر کے بھیجوں گا۔

خاک کرتا اور مٹاتا ہے

لوہم بھی خاک ہیں اور خاک کی تقدیر میں لکھا گیا ہے

”بے ارماں رہنا“

آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے اور وہ باہر صحن میں، چولہے کے قریب دادا جی اور دادی ماں کے پاس بیٹھی، اپنے پیارے عزیز دوست ایلان جعفری کی المناک موت کی روداد سن رہی تھی۔

”بڑا اچھا بچہ تھا نصیب کا، گاؤں میں ہر ایک سے یوں ملتا تھا، گویا سب اس کے قریبی رشتہ دار ہوں۔ جب بھی چھٹیوں میں شہر سے آتا، سبھی محلے والوں کے لئے نجانے کیا کیا خرید لاتا تھا۔ آدھی رات میں بھی کسی کو اس کی ضرورت پڑتی تو نیند سے اٹھ کر، فوراً دوڑ آتا، تمہارے دادا جی کے ساتھ تو بہت پیار تھا اس کا، اکثر یہ اس سے تمہاری، اور احسن پتر کی باتیں کرتے رہتے تھے، سچ بیٹی، اُس کے ہوتے ہوئے، ہمیں کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ ہم یہاں اکیلے ہیں۔ ایک بار محلے میں، افضل بھائی کی بیوی، بہت بیمار پڑ گئی۔ کوئی ان کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھا، لیکن اس وقت بھی، ایلان بیٹے نے ہمت دکھائی اور افضل بھائی کی نایاب بیوی کو، اپنے بازوؤں میں اٹھا کر، ڈاکٹر صاحب تک لے کر گیا وہ..... مگر..... یہاں گاؤں میں کوئی اس کے کام نہیں آیا، کسی نے اس کے حق میں گواہی نہیں دی کہ وہ بے قصور ہے.....“

دادی ماں کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھر آئی تھیں، جب وہ آنسوؤں بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ایلان نے کیا قصور کیا تھا دادی ماں..... کیوں کوئی اس کی مدد نہیں کر سکا.....؟“

وہ جانتی تھی، اگر احسن کو بھی یوں ایلان کی اچانک موت کا پتہ چلا وہ بھی شکا کڈ رہ جاتا، کوئکہ ایلان کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی۔ یہاں جب وہ دادا، دادی سے ملنے کے لئے آتا، تو اپنے ہر دل کا لمحہ لحد ایلان کی کمپنی میں ہی بسر کرتا تھا۔

دادی ماں کے بقول اسے معلوم ہوا تھا کہ گاؤں میں ایلان کے تین دوست تھے۔ احسن، ساجد اور جاوید، احسن تو خیر کبھی کبھار ہی گاؤں آتا تھا، مگر جاوید اور ساجد کے ساتھ ایلان کی خوب گاڑھی چھتی تھی۔ تینوں دن بھر کھیتوں میں مختلف کام مل کر انجام دیتے اور شام ڈھلے پرانے کونئیں کے پاس بیٹھ کر، خوب ہنسی مذاق کرتے۔

ایلان کی المناک موت کے بعد جہاں پگھٹ سنسان اور گاؤں ویران ہوا تھا،

وہیں ساجد اور جاوید بھی جیسے ہنستے کھیلتے زندہ انسانوں سے، گم صم پتھر کے بے جان مجسمے بن کر رہ گئے تھے۔ ایلان کی موت کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جاوید نے تو ہمیشہ کے لئے یہ گاؤں ہی چھوڑ دیا تھا، جب کہ ساجد کے لیوں پر تاحال چپ کے مضبوط قفل پڑے ہوئے تھے۔ اب نہ گاؤں کی کشادہ کچی گلیوں میں، کوئی کشش رہی تھی، نہ تہتی دوپہر کے اونچے اونچے درختوں میں، کوئی جاذبیت..... ہر سو جیسے ویرانی ہی ویرانی نکھر کر رہ گئی تھی۔

”بتائیے ناں دادی ماں، کیا قصور تھا ایلان کا، جو اس بد معاش غنڈے نے اس کی جان لے لی.....؟“ دادی ماں کو چپ چاپ سوچوں میں کھویا دیکھ کر اس نے اپنا سوال پھر دہرایا تھا، جب وہ دوپٹے کے پلو سے بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”اس کا قصور محبت تھا بیٹی، ان ظالم گاؤں والوں سے محبت..... آج سے چھ ماہ پہلے، بد معاش سنی استاد نے، اسی محلے میں مقیم رفیقہ کی بیٹی زلیخا کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ ایلان ان دنوں گاؤں میں ہی تھا۔ لہذا وہ رفیقہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو نہ دیکھ سکا اور غصے میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اکیلا، سنی دادا کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ خدا جانے وہاں اس کی سنی دادا سے کیا بات چیت ہوئی۔ گاؤں والوں کے بقول اس نے سنی دادا کا گریبان پکڑ کر، اینٹ سے اسکا سر زخمی کیا تھا، جس پر وہ مشتعل ہوا تھا اور اس نے پولیس کو ہاتھ میں کر کے ایلان کو گرفتار کر دیا۔ سنی دادا نے کیس مضبوط بنانے کے لئے اس پر گاؤں کے گھ وں میں لوٹ مار کا گھٹیا الزام لگایا اور گاؤں والوں کو دھمکی دی کہ اگر کسی نے ایلان کی، حمایت کرنے کی جرأت کی، تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا، گاؤں والوں نے سنی دادا کے الزام کی تصدیق کی تو کسی نے بھی ایلان بیٹے کا ساتھ نہیں دیا۔ سب سنی دادا کے سامنے خاموش تھے۔ یوں ایلان بیٹے کو شہر کی بڑی جیل میں بھیج دیا گیا، وہاں پورے چار ماہ، اس پر تشدد کیا جاتا رہا، بالآخر اس کے ایک شہری دوست نے اس کی مدد کی اور اس کا کیس عدالت میں چلا گیا۔ جھوٹے گواہوں اور جھوٹے الزامات کو سامنے رکھ کر، عدالت نے اسے دو سال قید کی سزا سنائی، مگر سنی دادا اس سزا سے خوش نہیں تھا لہذا اس نے پولیس سے ساز باز کر کے اسے سزا پوری ہونے سے قبل ہی جھوٹے پولیس مقابلے میں مروا دیا.....“ اب کے دادی ماں کا لہجہ، بری طرح سے بھرا گیا تھا۔ تبھی وہ اپنے جلتے ہوئے آنسو، بمشکل حلق میں اٹھیل کر بولی۔

”آپ لوگوں نے بھی تو ایلان کا ساتھ نہیں دیا بڑی ماں، کوئی تو اس کی مدد کرتا، کوئی تو سنی دادا کے خلاف آواز اٹھاتا، مگر نہیں۔ یہاں بسنے والے لوگ بھلا زندگی کا شعور ہی کہاں

بری طرح سے دکھ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ تیز بخار میں جلتے وجود کے ساتھ، وہ نیچے زمین پر بے یار و مددگار، بغیر کسی لحاف یا شال کے، گری پڑی تھی۔ خوبصورت سلکی بال بکھر کر گردن سے لپٹ چکے تھے۔ اس وقت اس کا حال اس قدر ابتر ہو رہا تھا کہ وہ خود اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”نجانے اس کے یوں ایک دم سے غائب ہو جانے پر، اس کے گھر میں کیا طوفان اٹھا ہوگا۔ اس کی چچی اور ملنے جلتے والوں نے، کس کس طرح سے اس فتنے کو ہوا دی ہوگی، نجانے اکیلے ذیشان بھائی نے کیسے سب کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا سامنا کیا ہوگا؟“

”آہ ذیشان بھائی، دیکھئے میں کتنی بے بسی کے ساتھ، آپ کے لئے سزا بھگت رہی ہوں، آج ایک اور بے قصور بہن، اپنے بھائی کے کینے پر قربان ہو رہی ہے، کاش آپ نے ایسا قدم اٹھانے سے قبل، صرف ایک بل کے لئے، میرے بارے میں سوچا ہوتا تو آج میرا، یہ حال نہ ہوتا، ذیشان بھائی، آج میرا یہ حال نہ ہوتا.....“

بری طرح گھومتے سر کو، گھٹنوں میں دبا کر، وہ شدت سے رو پڑی تھی، جب ایک مرتبہ پھر دروازہ، ہلکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا، اور اگلے ہی بل وہ ہاتھ میں پانی کا گلاس لئے، کمرے میں داخل ہو گیا۔

”صبح بخیر، محترمہ سبعتین الہدیٰ صاحبہ، لیجئے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی نوش فرمائیں.....“ شازنزل علی شاہ کے سرد لہجے پر اس نے آنسوؤں سے بھری متورم نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اور اگلے ہی بل لرزتے ہاتھوں کے ساتھ، ٹھنڈے پانی کا گلاس تھام لیا۔ شاید بخار کے باعث اس کا بدن تندور کی مانند جل رہا تھا، نقاہت کے مارے آنکھیں بند ہو رہی تھیں، مگر شازنزل علی شاہ کو اس پر رحم نہیں آیا۔

”چلو، کم آن، جلدی سے یہ پانی پیو اور اصطبل میں کام کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ.....“ سرخستے ہوئے چہرے سے نگاہ ہٹا کر، وہ کرخت لہجے میں بولا تھا، جب سبعتین نے چند گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس زمین پر رکھ دیا۔

”سنو..... ایک بڑی دلچسپ خبر ہے تمہارے لئے.....“

اسے گلاس زمین پر رکھتے دیکھ کر، وہ خاصے محفوظ ہونے والے انداز میں بولا تھا، جب سبعتین نے چونک کر اس کی سمت نگاہ کی۔

”کل میں نے تمہاری بے ہوشی کے دوران کچھ تصاویر بنا کر، تمہارے باپ کے

رکھتے ہیں زندگی سے پیار کرنے والے یہ بزدل لوگ کہاں مدد کریں گے کسی کی.....؟ یہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، پھر ایلان کی مدد کیسے کرتے؟ بہر حال میری رگوں میں میرے بہادر، فوجی باپ کا خون ہے دادی ماں، میں یہیں رہ کر، اس بدمعاش سنی دادا کے ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤں گی، میں ایلان کی جان ضائع نہیں جانے دوں گی دادی ماں، نہیں چپ بیٹھوں گی میں اب.....“ نور بھری بیگم کو جس بات کا اندیشہ تھا، وہی بات ہو گئی تھی، اسی لئے تو وہ اس سے حقیقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ جانتی تھیں کہ وہ زیادتی برداشت کرنے والی نہیں ہے۔ تبھی گڑبڑا کر، خاموش بیٹھے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے بولیں۔

”نہیں بیٹے..... تم اس حیوان کے منہ نہیں لگو گی، اسے کسی انسان کی، کوئی تمیز نہیں ہے۔ بہت ظالم ہے وہ، بے درد ہے۔ تجھے خدا کا واسطہ ہے۔ اپنے بوڑھے دادا دادی کے لئے مشکلیں نہ پیدا کر، خدا کے لئے شہر واپس چلی جا انزلہ..... خدا کے لئے شہر واپس چلی جا.....“ اس نے بہت حیرانگی سے دادی ماں کی طرف دیکھا تھا، جواب چپ چاپ آنسو بہا رہی تھیں۔

”بہت حیرانگی کی بات ہے دادی ماں، گاؤں والوں کو چھوڑیے، آپ..... آپ خود اتنی ویل ایجوکیٹڈ خاتون ہو کر، ایک بدمعاش انسان سے اس قدر خوف زدہ ہیں.....؟ کیوں ایک معمولی انسان کو، معاذ باللہ خدا کا درجہ دے رکھا ہے آپ لوگوں نے، کیوں اس سے ڈر ڈر کر، اس کے حوصلے بڑھائے ہوئے ہیں آپ نے..... وہ اگر گمراہ ہے، تو اسے ہدایت کا رستہ دکھائیے بڑی ماں، یہی تعلیم ہے ہمارے دین کی، میرے پیارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی، ظالم کے سامنے سر جھکا دینا، بذات خود بہت بڑا گناہ ہے دادی ماں، اور میں یہ گناہ کسی صورت قبول نہیں کروں گی.....“

انتہائی تیز لہجے میں اپنی بات کہنے کے بعد وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی، جب کہ حواس باختہ سی نور بھری بیگم انتہائی، بے بس انداز میں، پھر سے کریم بخش دادا کی جانب دیکھ کر، چپ چاپ رو پڑیں۔

☆☆☆

”پپ..... پانی.....“

بھوک اور نقاہت کے مارے وہ پچھلے آٹھ گھنٹوں سے مسلسل بے ہوش تھی، مگر وہاں اس کی فکر کرنے والا، کوئی نہیں تھا۔ شازنزل علی شاہ نامی وہ بے درد، جو اسے یہاں قید کر کے، خود حیوان بن چکا تھا اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بارے تکلیف کے، سبعتین کا ایک ایک جوڑ

یہاں گاؤں کے نسبتاً چھوٹے سے قبرستان میں، ایلان جعفری کی لمبی چوڑی قبر کے قریب بیٹھے ہوئے، اسے ایلان جعفری کے ساتھ، کالج میں بیتابا، ایک ایک پل شدت سے یاد آ رہا تھا وہ چھوٹی چھوٹی بات پر اس کا روٹھنا، اسے خوب تنگ کرنا، کبھی موڈ میں آکر، اپنے پیسوں سے اسے برگزینی، چائے کھانا، اس کے اداس ہونے پر مزے مزے کے لطفی سا کراس کا موڈ فریش کرنا، کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا کہ جسے وہ آسانی کے ساتھ فراموش کر سکتی۔

”کیوں یہاں آکر چپ چاپ سو گئے تم ایلان..... کیوں نہیں سوچا تم نے کہ تم مجھ سے نہیں روٹھو گے تو میں کسے مناؤں گی؟ کون مجھے اداس پا کر شگوفے سنائے گا؟ بولو ایلان..... کیوں نہیں سوچا تم نے، کہ تم نہیں ہو گے تو میں کس سے اپنے دل کی باتیں شیئر کروں گی..... یہاں تو بہت سناٹا ہے ایلان..... کیسے رہ رہے ہو تم یہاں..... تمہیں تو ذرا سی خاموشی سے وحشت ہونے لگتی تھی، پھر..... پھر یہاں اتنے سکون سے کیسے لیٹے ہوئے ہو تم.....؟ اٹھو ایلان، میرے ساتھ شہر چلو، میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے آئی ہوں، پلیز یہاں سے چلو ایلان، اور چل کر دیکھو کہ سارا کالج تمہارے بغیر، کیسے سناٹا پڑا ہے، وہ لائبریری، وہ کیمپس، وہ راہداری، جہاں تم گھنٹوں بیٹھ کر میری راہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں ایلان، اور..... اور کل کی اداس نگاہیں بھی تو ہر روز بے تابی سے تمہاری واپسی کی پل پل راہ دیکھ رہی ہیں ایلان، پلیز اس پاگل لڑکی کو بتاؤ آؤ کہ تمہیں اب کبھی واپس لوٹ کر شہر نہیں آنا، پلیز اسے بتاؤ آؤ ایلان پلیز.....“

وہ کب اپنا ضبط ہار گئی، اسے خود بھی معلوم نہ ہو سکا۔ تاہم اسی پل کوئی اس کے قریب سے گزرا اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں جا کر، سنی دادا کے حضور پیش ہو گیا۔

”استاد..... آپ کے لئے بہت اچھی خبر لے کر آیا ہوں، وہ گاؤں میں کریم بخش کا گھر ہے ناں، وہاں ایک بڑی خوبصورت لڑکی آئی ہے، ابھی ابھی میں نے اسے نصیب کے چھوکرے کی قبر پر بری طرح سے روتے ہوئے دیکھا ہے، بڑی غضب کی چیز ہے استاد، جل کر ایک نظر دیدار کر لیں.....“

آنے والے کی اطلاع پر ذرا سا چونک کر، سنی دادا نے مقناطیسی نگاہوں سے اس طرف دیکھا، پھر کچھ سوچتے ہوئے، وہ فوراً اسی اجنبی لڑکی سے ملنے کے لئے نکل کھڑا ہوا جس کی تعریف میں اس کا خادم مست ہوا جا رہا تھا۔

موسم میں قدرے خشکی تھی، اوپر سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھوکوں نے ماحول کو

آفس روانہ کر دیں تھیں، نتیجہ میری توقع کے عین مطابق نکلا ہے، یعنی تمہارا باپ، ہارٹ ایکٹ کا شکار ہو کر، اس وقت ہسپتال میں ”عیش“ کر رہا ہے.....“ سببیں کی متورم نگاہوں میں، بڑے اعتماد سے دیکھتے ہوئے وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا، جب وہ اچانک شدید مشتعل ہو کر اٹھی اور اس کے مضبوط کندھے پر کئے برسانے شروع کر دیئے۔

”یو باسنڈ..... تمہیں ہمت کیسے ہوئی کہ تم میری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر، میرے گھر والوں کو نقصان پہنچاؤ، تم..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی.....“

”شٹ اپ..... یہ تو ابھی شروعات ہے، آگے دیکھو، میں تمہارے گھر والوں کے ساتھ کیا کرتا ہوں.....“ انتہائی درشتی کے ساتھ، اس کے بازو جکڑ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ چلایا، اور اگلے ہی پل تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پیار کے سمندر میں ہر اترنے والے کو

کشتیاں نہیں ملتیں

دور دور تک جاناں دھوپ کی مسافت ہے

اور کہیں بھی پل بھر میں دھوپ کے مسافر پر

ساتباں نہیں کھلتے

اس عجب سمندر میں عمر کی ریاضت کے

بعد ہم نے جانا ہے

جس طرح فضاؤں میں اڑنے والے پنچھی پر

برس ہا برس میں بھی، بھید بھید رہتا ہے

راز داں نہیں ملتے، بام و در نہیں کھلتے

اس طرح محبت کے بحر بیکراں میں بھی

ہر اترنے والے کو کشتیاں نہیں ملتیں

پیار کے سمندر میں بھید بھید رہتا ہے

صبح کی ٹھنڈی پر غم ہوائیں، بڑی بے نیازی کے ساتھ، قطار در قطار لگے درختوں کی لمبی شاخوں سے اٹھکیاں کرتی ہوئیں، اس کے صبح چہرے کو چھو رہی تھیں، اور وہ دنیا جہاں سے بے خبر ہوئی، ایلان جعفری کی قبر پر بیٹھی، زار و قطار آنسو بہائے جا رہی تھی۔

بنارکھا تھا۔ مگر سنی استاد نے موسموں کی پرواہ کبھی نہیں کی تھی، وہ اب بھی سینہ بھلا کر تیزی سے راستہ طے کر رہا تھا کہ اچانک سامنے سے آنے والی خوبصورت سی پاکیزہ لڑکی کو دیکھ کر، اس کے قدم خود بخود ٹھنک گئے اور وہ شاکدنگا ہوں سے ساکت کھڑا، اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

ہم نے جنم سے پہلے جنم لیا
اور اپنی عمر سے پہلے بڑے ہوئے
بناء محبت، محبت کی، اور بنا قصور لائے گئے
ہم نے آج سے پہلے دن دیکھا اور دن سے پہلے رات
ہمیں دل سے پہلے درد ملا، اور درد سے پہلے مات
ہم نے آج دیکھا، مگر کل نہیں
اور کل بھی وہ کہ اگلا بل نہیں
کتے عجیب لوگ ہیں ہم
کہ زندگی سے پہلے جنے
اور موت سے پہلے مر گئے

اسے کڈ نیپ ہوئے آج تیرا دن تھا اور ان تین دنوں میں اسے اپنے گھر والوں کے متعلق کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی کہ وہ کس حال میں ہیں؟ اس کے جان سے پیارے پاپا کا اب کیا حال ہے؟ اس کی کیسی تصاویر بنا کر اس کے گھر والوں کو بھیجی گئی ہیں؟ اس ساری صورت الحال کے بعد، اس کے چچا، چچی اور دیگر رشتہ داروں کا کیا ری ایکشن ہے؟ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کے حال پر رحم کرتا اور اسے آزادی کا پروانہ دیتا۔

پچھلے تین روز سے اس نے سوائے پانی اور بخار کی ٹیبلٹ کے اور کوئی چیز حلق سے نہیں اتاری تھی۔ گوا سے ایک پھٹی پرانی سی گرم شال مہیا ہو گئی تھی۔ مگر اس کا بخار، اب بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ مارے کمزوری کے اسے پکڑا رہے تھے۔ اس میں اتنی سی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر، بائیں جانب بنی، کھڑکی تک ہی چلی آئے کہ جس سے باہر کے سرسبز مناظر بخوبی دیکھائی دیتے تھے۔

صبح کے دھندلے پھیل کر روشنی بکھیرنے لگے تھے، مگر وہ کسی بے جان جسم کی مانند

گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی، اپنی تکلیف کو ضبط کرنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔
کل رات سے شانزل علی شاہ کی آمد دوبارہ نہیں ہوئی تھی، اور وہ پچھلی دو راتوں کی مانند، اس رات میں بھی تنہائی کے خوف میں جکڑی، پل پل سکی رہی تھی۔ دعائیں مانگ مانگ کر اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے، مگر وہاں اس کی رہائی کے فی الحال کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

دن اب اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ تبھی اس کے کمرے کا مقفل دروازہ، ہلکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا، اور اگلے ہی پل بلیک پیٹن شرٹ میں لمبوس شانزل علی شاہ، انتہائی جارحانہ تیور لئے، اس کی سمت بڑھ آیا۔

”اٹھو..... کہا تھا ناں تمہیں کہ میری آمد سے قبل، تم اصطبل میں جا کر، وہاں صفائی کے فرائض سرانجام دو گی، پھر کیوں خلاف ورزی کر رہی ہو میرے حکم کی.....“ اس نے سبوعین کا بازو اتنی سختی سے دبوچا تھا کہ بے اختیار اس کے سسکاری نکل گئی تھی۔

”مم..... مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہے.....“

نجانے کیسے خشک لبوں پر زبان پھیر کر، بمشکل اس نے کہا تھا، جب وہ طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

”اچھا.....؟ تمہارے بھائی میں تو بہت کچھ کر گزرنے کی ہمت ہے..... خیر شکر کرو کہ میں نے مشتعل ہونے کے باوجود اس کی جان نہیں لی، وگرنہ میری پہنچ سے قطعی دور نہیں تھا وہ اب جو میں نے تمہارے ذریعے اسے سبق سکھانے کا ارادہ کیا ہے تو میرے ارادے میں روڑے نہ اٹکاؤ، وگرنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم ایک عورت ہو.....“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”کم آن..... اٹھو اب، مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں.....“ اب کے اس نے ہاتھ بڑا کر اس کا بازو تھاما اور زبردستی کھینچ کر کھڑا کر دیا۔

”چلو شاہاش، سب سے پہلے ان گھوڑوں کو چار اڈالو، پھر اس کے بعد یہ کچرا سمیٹو۔“

تب تک میں اپنے دوست سے تمہارے باپ کا حال احوال معلوم کرتا ہوں.....“
اسے اصطبل میں دھکیل کر، وہ خود ایک سائیز پر بیٹھتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا اور اگلے ہی پل پیٹن کی پاکٹ سے موبائل نکال کر، اپنے دوست کے نمبرز پریس کرنے لگا۔

”ہاں ہیلو کاشی، شان بول رہا ہوں، سناؤ دشمنوں کا کیا حال ہے آج کل.....؟“

کن آنکھوں سے، شال لپیٹ، گھوڑوں کے آگے، چارہ ڈالتی سبوعین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا.....“ اس کے لہجے پر کام میں مصروف سبوعین الہدی لپک کر اس کی طرف آئی، جواب کہہ رہا تھا۔

”ہاں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے..... خیر یو ڈونٹ وری، اب جو اگلا قدم میں اٹھاؤں گا، اس پر بڑھے کی موت یقینی ہے اور اس بار تم دیکھنا۔ خدا میرا ساتھ دے گا، او کے بعد میں بات کریں گے.....“

الوداعیہ کلمات کہہ کر جونہی اس نے موبائل آف کیا، ٹڈیال سی سبوعین الہدی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

”تمہیں خدا کا واسطہ ہے شانزل علی شاہ، مجھ پر اور میرے گھر والوں پر ترس کھاؤ، خدا کے لئے میرے بھائی کو معاف کر دو، پلیز.....“

”کیوں..... تم سے میرا کوئی معاشرہ چل رہا ہے، جو تمہارے کہنے پر، میں اس کی خطا نظر انداز کر دوں، اور پھر، جو تکلیف مجھے میرے ڈیڈ کی ڈیڈ سے اٹھانا پڑی ہے، وہی تکلیف میں تمہارے اس کہنے بھائی کو ضرور دوں گا، تبھی میرے سینے میں لگی آگ ٹھنڈی ہو گی۔“ اپنے بھاری بوٹوں پر سے سبوعین کے نازک ہاتھ پرے جھٹک کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا، تبھی وہ چلا اٹھی۔

”میرے باپ کی جان لینے کے بعد، کیا تمہارے ڈیڈی پھر سے زندہ ہو جائیں گے؟ تم تو اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہو شانزل علی شاہ کہ ساری زندگی جن کا شیوہ عنود درگزر رہا، تم اس پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہو کر بھی، میرے بھائی کی ایک خطا معاف نہیں کر سکتے، جب کہ وہ خدا، کہ جس نے یہ ساری کائنات پیدا کی ہے، وہ تو اپنے گنہگار بندے کے بڑے سے بڑے گناہ کو، جب چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، معاذ اللہ تم اس خالق حقیقی سے بڑھ کر تو نہیں ہو شانزل، پھر کیوں تباہ کرنا چاہتے ہو ہماری زندگیوں کو؟“

وہ بری طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ تبھی وہ اس سے توجہ ہٹا کر، سگریٹ

جلاتے ہوئے بولا۔

”ہاں، درست کہا تم نے، خدا جب چاہتا ہے، اپنے گنہگار بندے کو معاف کر دیتا ہے، مگر میں خدا نہیں ہوں، سمجھی تم.....؟ مت یہ یسوعے بہا کر دکھایا کرو مجھے، زہر لگتے ہیں یہ

ہے، لہذا اپنے دل میں لگی آگ تو میں بجھا کر ہی رہوں گا.....“ انتہائی درشتی کے ساتھ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد، اس نے جلتا ہوا سگریٹ قریب کھڑی سبوعین کے بازو سے مس کر دیا تو مارے تکلیف کے وہ چلا اٹھی۔

”کم آن بے بی، یہ چیخنا چلانا بند کر کے، اب کوئی کام کرو، ورنہ میں بیلٹ کا استعمال کرنا بھی جانتا ہوں، اور جان لو، کہ تم لوگوں کو جس قدر تکلیف پہنچتی ہے، میں اتنا ہی سکون محسوس کرتا ہوں.....“ وہ باہر سے جتنا پُرسکون نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی وحشی تھا وہ سبوعین کو اس لمحے اُس سے اتنی نفرت محسوس ہوئی، کہ وہ ٹھنڈی لرز کر رہ گئی۔ جب کہ اس کے مقابل کھڑا، وہ خوبرو سا، سنگدل شخص، بڑے ریلیکس انداز میں اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے، پھر سے اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

تجھ کو پانے کی تمنا تھی جو پوری نہ ہوئی!
کوئی حسرت ہی نہیں حسرتِ ناکام کے بعد!
مجھ سے جس شام کو تو آ کے ملا تھا سنگدل
شام ویسی نہیں آئی۔ کبھی اس شام کے بعد

آف وائیٹ کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس، بھگی پلکوں والی، وہ قدرے نازک سی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ گویا مہوت ہوئے ٹکڑے سے دیکھ رہا تھا۔

”میرا راستہ چھوڑو، زندگی میں پہلے کبھی، کوئی لڑکی نہیں دیکھی ہے کیا.....؟“ انزلہ کی روشن پیشانی پر، ایک قدرے آوارہ سے لڑکے کو سامنے کھڑے پا کر، کئی بل پڑے تھے، جب اس کے ساتھ رف حلیے والے شخص کے بائیں طرف کھڑا، وہ قدرے تیز مزاج والا چچہ ٹائپ لڑکا، سینہ پھلا کر بولا۔

”استاد سے ادب سے بات کرو لڑکی، آج تک کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ استاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے.....“

”وہاٹ..... یو مین یہ سنی دادا ہے.....؟“

انزلہ کی آنکھیں حیرانگی سے قدرے پھلی تھیں۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ سنی دادا کوئی ادھیڑ عمر کا بد شکل سا، دیوبیکل، شخص ہوگا کہ جس سے سارے گاؤں والے پناہ مانگتے ہیں، مگر یہاں تو معاملہ ہی اور نکلا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا، وہ اٹھائیس، تیس سالہ، خوبروسا بے نیاز

شخص، ظالم سنی دادا ہوگا، انزلہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

”دیکھا استاد، آپ کے نام کی دہشت ہی کافی ہے۔ لگتا ہے بلبل پہلی بار آئی ہے گاؤں میں.....“ اسے شاکد پا کر، سنی دادا کے پہلو میں کھڑے، اس چچہ ناپ شخص نے فخریہ انداز میں سنی دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے الفاظ کو خود ہی انجوائے کرتے ہوئے ہنس پڑا۔

”تم ڈیرے پر جاؤ مارجے، مجھے کچھ بات کرنی ہے.....“

ہمیشہ کڑک بولنے والے سنی استاد کا لہجہ، اس وقت قدرے دھیمہ تھا، تبھی وہ شخص، کمینگی سے مسکراہٹ لیوں پر پھیلا کر معنی خیز نگاہوں سے انزلہ کی طرف دیکھتے ہوئے واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

”میرا راستہ کیوں روکا ہے تم نے.....؟ شاید تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔“ سنی دادا کے چچے کو واپس پلٹتے دیکھ کر، وہ نفرت سے چلائی تھی، جب وہ دو قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مجھض ایک میں ہی تو جانتا ہوں کہ تم کون ہو، بہر حال اس نصیب کے بیٹے سے کیا تعلق تھا تمہارا.....“

”تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو، وحشی انسان.....“ چلا کر کہتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”گالی مت دو جانم..... کیونکہ تم نہیں جانتی کہ جب سنی دادا کا دماغ گھومتا ہے، تو وہ انسان نہیں رہتا.....“

جگر جگر کرتی ہوئی، غلافی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔

”شٹ اپ، تم جیسا بے درد، جاہل اور ظالم شخص، ایک انسان کیسے ہو سکتا ہے، تم تو حیوانیت میں درندوں سے بھی بڑھ کر ہو.....“ وہ پھر قدرے ایڈوشل ہوئی تھی۔

”بس..... آگے ایک لفظ مت کہنا، وگرنہ میں بھول جاؤں گا کہ میرے سامنے وہ انزلہ شاہ کھڑی ہے کہ جسے کبھی انسانیت کے پریڈ میں، میرے دل نے چاہنے کی جسارت کی تھی.....“

اب کے شاکد ہونے کی باری انزلہ شاہ کی تھی، ایک قطعی اجنبی، شخص کہ جس کے تصور سے بھی وہ شدید نفرت محسوس کرتی تھی، وہ اس کا نام جانتا تھا، اور نہ صرف نام جانتا تھا، بلکہ اس سے محبت کا دعویٰ بھی کر رہا تھا۔

”بند کرو اپنی گندی بکواس، خبردار جو آئندہ تمہارے ہونٹوں نے میرا نام لیا تو، تم جیسا حیوان کیا، جانے کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ انسانیت کا کیا مفہوم ہے.....؟ تم صرف ظلم کرنا جانتے ہو، دکھ دینا جانتے ہو، محض چلتے پھرتے زندہ انسانوں کی زندگی چھین کر، انہیں قبر کی تاریکیوں میں گم کرنا آتا ہے تمہیں، تم کسی کو چاہ نہیں سکتے، کسی کو زندگی نہیں دے سکتے تم، سمجھے.....“

شاید اشتعال کے باعث اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ جب اس کے سامنے کھڑے اس رف چلیے والے، سنگدل سے شخص نے، جما کر ایک زبردست تمانچہ، اس کے بائیں گال پر رسید کر دیا۔

”تزاخ.....“

”بہت زیادہ بولتی ہے جانم، مگر سنی استاد کو اونچے لہجے پسند نہیں، اگر اس گاؤں میں رہنا ہے تو وہی قانون اپنانا ہوگا جو میں نے یہاں لاگو کیا ہے، بصورت دیگر، تم شہر واپس جا سکتی ہو.....“ اس کے چلیے کی نسبت، اس کا لہجہ خاصا سلجھا ہوا تھا۔ زبردست چاٹا لگانے کے بعد وہ اتنا پرسکون دکھائی دے رہا تھا، گویا ایسی ”حکمتیں“ اس کے لئے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہوں۔

”یو باسٹرڈ..... تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ.....“

اگلے ہی پل اس نے شدید مشتعل ہو کر، اس کا گریبان تھامنا تھا، جب وہ محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”میری جرأت کا ابھی تمہیں اندازہ ہی کہاں ہے سویت ہارٹ، خیر کوئی بات نہیں، چند دن مزید یہاں، گزارے تو یہ اندازہ بھی ہو ہی جائے گا.....“

وہ کسی بھی طرح سے عیاں ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا، تبھی وہ سختی سے اپنے ہاتھ، اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

”بس، مسٹر سنی..... بہت حکمرانی کر لی تم نے یہاں، اب اور نہیں.....“ غصے میں سرخ نگاہیں، اس کی مقناطیسی نگاہوں سے ملا کر، وہ انتہائی ترش لہجے میں بولی، اور اسی انداز سے، اس کے گداز لیوں کے گوشوں میں دبی، دلچسپ مسکراہٹ دیکھتے ہوئے، سرعت سے آگے بڑھ گئی۔ شدید اشتعال کے باعث، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آج وہ سنی استاد کو شوٹ کر ڈالتی۔

”سنو پڈ مین..... آج ہی احسن بھیا کو کال کر کے، اسے جیل کی ہوائ نہ کھلائی تو انزلہ شاہ، نام نہیں میرا.....“

منہ میں بڑبڑاتے ہوئے۔ وہ بے نیازی سے آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک راہ

میں پڑا کوئی نوکیلا کائنا، اس کے بائیں پاؤں کی ایزھی میں پوست ہو گیا، نازک سا جوتا، اسے اس تکلیف سے بچانے میں ناکافی ثابت ہوا تھا۔ تبھی ایک ہلکی سی سسکاری، اس کے لبوں سے خارج ہو کر رہ گئی۔

”ہا..... ہا..... ہا..... دیکھا محترمہ انزلہ شاہ صاحبہ، کہ گاؤں میں پیدل چلنے کا سلیقہ بھی تمہیں نہیں آتا، چلی ہوئی استاد سے ٹکر لینے۔ پہلے یہاں چلنے کا سلیقہ تو سیکھ لو.....“

جانے کس لمحے وہ اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ انزلہ اس وقت، قدرے حیران نگاہوں میں خفگی لئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جب محبت لٹائی نگاہوں سے کچھ بل، اس کی سمت دیکھنے کے بعد، وہ آہستہ سے جھکا اور انزلہ کا پاؤں تھام کر، نوکیلا کائنا، اس کی ایزھی سے نکال دیا۔

”وش یو گڈ لک سویٹ ہارٹ، کل پھر ملاقات ہوگی.....“

کائنا پرے پھینک کر، وہ انتہائی دوستانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، پھر آہستہ سے اس گال تپتپتا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا، جب کہ شک کڈ کھڑی انزلہ شاہ، پھٹی پھٹی نگاہوں سے دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اب ہماری آنکھوں میں، اب ہماری باتوں میں

اب ہمارے ہاتھوں میں

پھول ہیں نہ کلیاں ہیں

رنگ ہیں نہ موتی ہیں

چاہ ایسی ہوتی ہے

جو مٹا کے رکھ چھوڑے، جو جلا کر رکھ چھوڑے

زیست کی سبھی خوشیاں، مسکرا کے لے جائے

ساحلوں پہ آئی موج، کس طرح بہا کے لے جائے

پیچھے رہنے والوں کی زندگی بدل جائے

پوری رات ڈھل جائے

اور ان کے ہاتھوں کے پھول اور سبھی کلیاں

رنگ اور سبھی موتی

آنسوؤں میں بہہ جائیں

صرف ان کے ہونٹوں پر حسرتیں ہوں خواہش ہو یوں نہ آزمائش ہو
رات کے تقریباً دو بج رہے تھے اور وہ اکیلا سرد ہواؤں کے سنگ سرسبز وسیع لان
میں، کین کی چیر پر بیٹھا، پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ذہن کے کسی بھی
گوشتے میں، جیسے سکون نامی، کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

ایسا تو نہیں تھا وہ، وہ تو بہت نرم دل تھا۔ خواتین کی بے حد عزت کرنے والا، خود اس
کی اپنی بہن محرش سے محبت مثالی تھی، وہ ایک بل بھی، گھر میں نگاہوں سے اوجھل ہوتی، تو اس
کی جان پر بن آتی تھی، اسے ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنے کے لئے ہی تو، اس کا رشتہ، اپنے
قریبی دوست کے ساتھ طے کیا تھا اس نے، جو اس کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کا
برنس پارٹنر بھی تھا، اور بھری دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ بہن بھائی تو تھے ہی نہیں، والدین کا ابھی
کچھ عرصہ قبل ہی انتقال ہوا تھا۔ لہذا ہر طرح سے مطمئن تھا کہ اس کا دوست اس کی بہن سے
شادی کے بعد، اس کی ریکویسٹ پر، ان کے ساتھ ہی رہے گا۔ مگر..... کیا ہوا تھا؟

کچھ بھی تو ویسے نہ ہو سکا کہ جیسے اس نے پلان کیا تھا۔ جلتا سلگتا ذہن، ایک مرتبہ
پھر ذیشان رحمانی کی طرف چلا گیا اور ذیشان رحمانی کے تصور کے ساتھ ہی، اس کی نازک اندام
سی بہن، سعین الہدیٰ، اس کے خیالوں میں در آئی۔

”آہ..... کیا تصور ہے اس معصوم سی لڑکی کا، کیوں اس پر اتنا ظلم کر رہا ہوں میں، اگر
اس کے بھائی نے گناہ کیا ہے تو سزا میں اسے کیوں دے رہا ہوں.....؟ کیوں بھول گیا ہوں کہ
وہ بھی ایک عورت ہے، کالج سے زیادہ نازک صنف..... اگر..... وہ میرے انتقام کی بھیجٹ
چڑھ کر ختم ہو گئی تو کیا ہوگا؟“ بل دو بل کے لئے، دل نے ڈرتے ڈرتے، اپنا مقدمہ پیش کیا
تھا اور وہ واقعی مضطرب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا، کہ اسی بل نگاہوں کے سامنے، وہ منحوس دن گھوم گیا
کہ جب اس کا گھر، بے شمار ملنے جلنے والے مہمانوں سے کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف، ہر کوئی
خوشیاں منا رہا تھا۔ خود اس کے پیارے ڈیڈ، کتنے خوش، دکھائی دے رہے تھے۔ ہر کام میں
آگے بڑھ چڑھ کر، ملازموں کو خود ہدایت کر رہے تھے۔ وہ خود بھی تو بہت مسرور تھا، بارات آ
چکی تھی۔ اس کے دوست احباب، کزن، سب خوشی خوشی، آنے والے مہمانوں کا استقبال کر
رہے تھے، نکاح کی تیاریاں، خوب جوش و خروش سے کی جا رہی تھی کہ اسی بل گھر کے اندر سے
خواتین نے شور مچا دیا۔

”دلہن بھاگ گئی، دلہن فرار ہو گئی.....“

ایک قیامت تھی جو اس پر ٹوٹ پڑی تھی، قطعی حواس باختہ ہو کر، وہ لان سے اندر سحرش کے کمرے کی طرف بھاگا تھا، پاگلوں کی طرح، اسے گھر کے ایک ایک کونے میں ڈھونڈا تھا، مگر سحرش علی شاہ کو نہیں ملنا تھا، سو وہ نہیں ملی، تاہم اس کی ڈائری میں تبہ کیا رکھا ہوا ایک خط ضرور مل گیا تھا، جس میں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔

”ذیشان، میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں، کیونکہ میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں میں نے صرف تم کو اپنا ہم سفر مانا ہے ذیشان، میں صرف تمہاری ہی بنوں گی، مجھے معلوم ہے کہ بھیا صرف ضد کی وجہ سے تمہیں پسند نہیں کرتے، وگرنہ تم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، بہر حال اب اپنی زندگی کا فیصلہ خود مجھے کرنا ہے ذیشان، اور میرا فیصلہ تمہاری محبت کے حق میں ہے، آؤ اور مجھے یہاں سے دور لے جاؤ ذیشان، میں خلوص دل سے، تمہاری آمد کی منتظر ہوں.....“

اس وقت سحرش کے خط میں لکھے الفاظ پڑھ کر، اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا، شریانیں جیسے پھنسنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چلا تھا کاش سحرش اور ذیشان رحمانی، اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتے اور وہ انہیں ایک ساتھ شوٹ کر ڈالتا۔

جلتے الاؤ پر تیل چھڑکنے کا کام، اس کے عزیز ڈیڈ کے زبردست ہارٹ ایک نے کیا۔ آئی۔ سی۔ یو میں، زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے بھی، وہ سحرش کو پکارتے رہے تھے، اور یہیں سے اس کے ذہن میں، ذیشان رحمانی کی جواں سالہ بہن کو کڈنیپ کر کے، اس سے انتقام لینے کا منصوبہ بیدار ہوا تھا۔ وہ بے درد نہیں تھا، مگر اپنے عزیز ڈیڈ کی وفات اور شہ داروں کی زہر میں بھیجی اشتعال انگیز باتوں نے، اسے انسان سے حیوان بنا دیا تھا۔ سونے پہ سہاگہ، ذیشان رحمانی کی بے نیازی تھی۔ شانزل نے اس پر اپنی بہن کے اغواء کا الزام لگا کر اسے اریسٹ کر دیا تھا، مگر اس کے پاس اپنے الزام کو چھ ثابت کرنے کے لئے، کوئی ثبوت نہیں تھا، یوں ذیشان رحمانی، آسانی سے رہا ہو گیا اور نہ صرف رہا ہو گیا، بلکہ اس نے خود شانزل علی شاہ پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔

یوں اس کے اندر بھڑکتی انتقام کی آگ مزید بڑھ گئی اور اس کے عتاب کا شکار اس کی اپنی سگی، بہن سببین الہدیٰ کو بننا پڑا۔

سببین الہدیٰ کا تصور کرتے ہی، وہ پھر مضطرب ہوا تھا تھا۔

آنسوؤں سے لبالب بھری اس کی معصوم نگاہیں، شدید بخار میں تپ کر کپکپاتا وجود، درد اور بھوک سے کم لایا چہرہ، اسے رہ رہ کر پریشان کر رہے تھے۔

”نہیں..... مجھے اپنے دل کو مضبوط کرنا ہوگا، جس طرح اس ذلیل انسان نے میری بہن کے ذریعے، مجھے تکلیف پہنچائی ہے، میں بھی اسی طرح اس کی بہن کے ذریعے، اسے تکلیف پہنچاؤں گا، مجھے ہرگز یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ میرے دشمن کی بہن ہے، اس دشمن کی، جو ہر قدم پر مجھے شکست دیتا آیا ہے، یونیورسٹی میں، بزنس میں، اور..... اب عملی زندگی میں بھی، میں اسے آسانی سے معاف نہیں کروں گا، ہرگز معاف نہیں کروں گا اسے.....“

دل کا مقدمہ، دماغ کی دلیل تلے دب گیا، اور وہ اسی وقت پھر سے اپنے فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا، رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ سرد سرائی ہوا میں عجیب سی کپکپی دوڑا رہی تھیں۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ، سردی کے باعث پھسل رہے تھے، مگر اس کا دل جل رہا تھا۔ غصے اور انتقام کی آگ نے اسے اندھا کر چھوڑا تھا۔ سخت ٹھنڈی رات کے ساڑھے تین بجے، جب وہ لاکنڈ دروازہ کھول کر سببین الہدیٰ کے پاس آیا تو، وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی، بری طرح کپکپا رہی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور آنکھیں قدرے باہر کو ابل آئی تھیں۔ کمرے میں بستر، کمبل، یا چارپائی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرسی، یا میزیک کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ سو وہ ٹھنڈی زمین پر، سکر کر بیٹھی، گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ ایک پل کے لئے اس کا دل تڑپا، مگر اگلے ہی پل پھر دماغ دل پر غالب آ گیا۔ سببین نے ہلکی سے آہٹ پر فوراً چوٹکتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا، پھر اس پر نگاہ پڑتے ہی بے بسی سے رو پڑی تھی۔

”رو کیوں رہی ہو.....“ اس کے رویے پر دل کو کچھ ہوا تھا، تبھی وہ دھاڑ کر بولا تو سببین نے لپک کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

”مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے، خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، پلیز.....“ وہی آنسوؤں میں بھیگا اس کا سسکتا ہوا چہرہ اور وہی متورم آنکھیں، شانزل علی شاہ نے لمبے سے قبل اپنا رخ بدلا تھا۔

”چھوڑ دوں گا، مگر تمہارے وجود اور روح کو داغدار کرنے کے بعد، تاکہ تمہارے اس کینے بھائی کو معلوم ہو جائے، کہ کسی کی عزت سے کھیلنا کتنا مہنگا پڑتا ہے.....“

”نہیں تم ایسا نہیں کرو گے، تہ..... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے.....“ وہ عاجزی سے گڑ گڑائی تھی جب وہ پھنکارا۔

”کیوں نہیں کر سکتا، میں کیا مرد نہیں ہوں.....؟ یا میں نے کوئی دیوتا ہونے کا

سرفشکیٹ لیا ہوا ہے.....؟“

سبعین کا پور پور اس کی سگریٹ کے نشانوں اور بیلٹ کی ضربوں سے گھائل تھا، مگر پھر بھی وہ اس کے الفاظ پر خوف سے پیلی پڑ گئی تھی۔ شانزل نے اسے اپنے قدموں سے اٹھانے کے لئے، جو نبی اس کا بازو، دبوچا، وہ کراہ کر رہ گئی۔ ہاف آستینوں والے دودھیا بازو پر سگریٹ سے جلے ہوئے نشانات اور اس کی پینٹ کے بھاری بیلٹ کی ضربیں تازہ تھیں۔ اسے بے اختیار یاد آیا کہ کل اس کی معمولی سی غلطی پر، کس طرح آپے سے باہر ہو کر اس نے، اس نازک سے وجود پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے، کیسے اس کے ریشمی بالوں کو پکڑ کر، اسے شدید اذیت سے دوچار کیا تھا۔

وہ اس سے اتنی سہم گئی تھی کہ اگر وہ ضرورت کے لئے بھی ہاتھ اٹھاتا تو وہ خوف سے لرز کر رہ جاتی تھی۔ رات کے تاریک لمحے نہایت سبک روی کے ساتھ، اپنا سفر مکمل کر رہے تھے۔ کمرے میں لگی دودھیا لائٹ، اس کے سامنے کھڑی، اس نازک سی لڑکی کا حال، اس پر بخوبی عیاں کر رہی تھی۔

تبھی وہ نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس کی سمت بڑھا تھا، مگر سبعین نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے، دو قدم مزید پیچھے ہٹائے تھے۔ بکھرے بالوں اور الجھے حواسوں والی، یہ نازک سی لڑکی خوف سے بری طرح لرز رہی تھی۔ جب شانزل علی شاہ نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں قید کر لیا۔

”نہیں..... خدا کے لئے مجھے داغدار مت کرو، چاہو تو میرے بدن کو سگریٹ سے جلا دو، نار مار کر کھال ادھیڑ دو میری، مگر خدا کے لئے مجھ سے میری نساوایت کا غرور مت چھینو، تمہیں خدا کے پیارے رسول کا واسطہ، میری شخصیت کو پاکیزہ رہنے دو، پلیر.....“

بری طرح سے لرزتے ہوئے، وہ نہایت عاجزی سے گڑ گڑائی تھی، مگر شانزل علی شاہ پر تو اس وقت اور ہی نشہ سوار تھا۔ وہ بھلا کچھ سننے اور سمجھنے کی پوزیشن میں تھا ہی کہاں، جو اس کے واسطوں کی لاج رکھتا، اس کے آنسوؤں میں چھپے کرب کی گہرائی کو سمجھتا، اس کے شدید غبار میں جلتے، زخموں سے چور بدن کا، لحاظ کرتا۔

دھیرے دھیرے اپنے اختتام کو پہنچتی اس رات کے یہ قیامت خیز لمحے، نجانے کتنی تباہی لاتے کہ وہ ایک دم سے ہوش و حواس کھو کر، زمین پر گر پڑی، خوف سے زرد چہرہ، اس وقت سفید ہو گیا تھا، اور وہ ہلکے ہلکے لرزتے ہوئے، بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ تاہم

اس سے پہلے کہ وہ اسے اٹھا کر، ہوسپل کی طرف بھاگتا، اس کا سیل تیزی سے چیخ اٹھا، کپکپاتے ہاتھوں، سے اس نے سیل آن کیا، تو دوسری طرف روتی، بلکتی سحر علی شاہ کی آواز سن کر شا کڈ رہ گیا۔

”ہیلو بھیا، میں دوپٹی سے سحرش بول رہی ہوں، یہاں اپنی فرینڈ کے گھر سے، بھیا مجھے ڈیڈ کے بارے ابھی پتہ چلا ہے، آئی ایم ویری ڈسٹرب بھیا.....“ وہ سسک رہی تھی اور ادھر شانزل علی شاہ، جیسے پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

خدا ادراک سے آگے تھی تیرے ہجر کی شام

ڈھونڈنے تجھ کو کہاں، چاند ستارے جاتے

تجھ سے منسوب ہوئے ہیں تو یہ حسرت ہی رہی

ہم کبھی اپنے حوالے سے پکارے جاتے!

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں جھولتے، اونچے اونچے سرسبز درخت اور نیلے آسمان پر چھائے کالے گھنگھور بادل، ماحول کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کر رہے تھے۔ ایسے موسم میں، گاؤں کے کشادہ کچے گھروں سے اٹھتی حلوے، پکڑوں اور دیگر مزے دار پکوانوں کی خوشبو طبیعت کو فریش کر دیتی تھی۔

دادی ماں بھی اس کے لئے، مزے مزے کے پکڑے تل رہی تھی، مگر اس کا ذہن مسلسل سنی دادا کے تصور میں الجھا ہوا تھا۔ اپنے لب و لہجے سے وہ خاصا پڑھا لکھا دکھائی دیتا، مگر اس کی حرکتیں، اس کے کام..... اسے انتہائی جاہل ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

”کیوں..... کیوں میں اس کے تصور سے پیچھا نہیں چھڑا رہی، پھر..... اگر وہ ایجوکیڈ ہے، تو کیوں اس قدر، جہالت کا مظاہرہ کر رہا ہے، وہ کون سی وجوہات ہیں کہ جس نے اسے ایک انسان سے حیوان بنا چھوڑا ہے، کیوں مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا اس نے..... بھلا کہاں جانتا ہو گا وہ مجھے.....؟“

مسلسل یہی سوال اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے اور وہ جیسے پاگل ہونے کو تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سنی استاد جیسے ادباً شخص کو بھلا اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ وہ تو یہاں گاؤں میں، کسی کے سامنے نہیں آئی تھی، اور اس سے پہلے بھلا گاؤں میں اس کی آمد بھی کہاں ہوئی تھی، تو پھر، پھر کیوں اس نے میرا راستہ روک کر، مجھ سے محبت کا اظہار کیا۔ کیوں

میرا نام لیا اس نے، آخر کیوں.....؟

دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر، وہ بے بسی سے اپنے بستر پر ڈھے گئی تھی، جب اچانک اس کی مقناطیسی نگاہیں، تصور کے پردے پر ابھر آئیں اور بے ساختہ اسے یاد آگیا کہ سنی استاد نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ نئی نئی یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ احسن شاہ، کالاسٹ سسٹر چل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایلان بھی یونیورسٹی سے، بس فارغ ہونے کو تیار تھا، کیونکہ وہ دونوں اچھے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ شروع کے چند دنوں میں اس نے احسن شاہ اور ایلان جعفری کی کمپنی کو بہت انجوائے کیا تھا، مگر اسی انجوائے منٹ کے ساتھ، وہ بعض اوقات، خود کو کسی کی مقناطیسی نگاہوں کی گرفت میں پا کر، گھبرا بھی جاتی تھی۔ پہلے پہل تو اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے، مگر بعد میں اس کی ایک دوست نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پورے ڈیپارٹمنٹ میں، سب سے زیادہ ذہین اور ہر دل عزیز سٹوڈنٹ سنعان شاہد تھا، جس کی ذہانت، قابلیت اور خوبصورتی کے چرچے، زبان زد عام تھے۔ وہ پوری یونیورسٹی کا چہیتا تھا۔ جس راستے سے بھی گزرتا، لڑکیاں اس راستے پر اپنے دل بچھا دیا کرتی تھیں۔

مگر وہ اتنا مغرور تھا کہ آنکھ اٹھا کر بھی کسی حسین سے حسین ترین لڑکی کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ اپنی دوست کی زبانی، سنعان شاہد کا احوال سن کر، گھٹنوں اس کا دل بے قابو رہا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میڑھیوں پر، راہداری میں، لائبریری میں اکثر اس کی راہ روک کر کھڑا ہونے والا، وہ مغرور شہزادہ، اتنا قابل انسان ہے۔ مگر اس کے پہلے کہ وہ سنعان شاہد کے حسین خواب اپنی آنکھوں کے سپرد کرتی، اپنے دل کو، اس کی آہٹوں پر دھڑکنا سکھاتی۔ وہ اپنے پیار کے ایک ننھی سی کوئیل بھی، اس کے دل کی سرزمین پر اگائے بغیر یونیورسٹی چھوڑ گیا۔

انزلہ شاہ کو آج بھی یاد تھا کہ وہ اس کے یوں نگاہوں سے دور ہو جانے پر، کیسے پورے ایک ہفتے تک بلک بلک کر روتی رہی تھی، اس کی جدائی میں اپنا حال سے بے حال کر لیا تھا اس نے۔ کھانا پینا، ہنسنا بولنا، سب بھول گئی تھی۔ وہ مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔

وہ یہ حقیقت قبول کر چکی تھی کہ کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں، مگر وہ بچھڑ جاتے ہیں، لہذا وقت کے ساتھ ساتھ، اس نے بھی خود کو بہلا لیا، مگر آج یہ کیسی حقیقت منکشف ہوئی تھی اس پر کہ وہ سر تا پیر حیرانیوں کی دلدل میں غرق ہو کر رہ گئی۔ وہ سارے اساتذہ کا چہیتا، وہ ہر لڑکی کا آئیڈل، وہ تیکھے نقوش اور مقناطیسی نگاہوں والا، مغرور شہزادہ، وہ ایک غنڈا بن کر، آج اس کے سامنے آیا تھا، کیوں.....؟

انزلہ شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، وہ محض گاؤں والوں پر اس کے ظلم کا دکھ منا رہی تھی، ایلان جعفری، جو اس کا سب سے اچھا اور عزیز ترین دوست تھا، اس کی موت کا درد، دل میں پال رہی تھی، مگر یہ حقیقت تو اس پر ابھی عیاں ہوئی تھی کہ وہ اس کا بھی مجرم ہے۔ اس نے نہایت سفاکی سے، اس کی محبت کا بھی گلہ گھونٹ کر، اسے بے گور و کفن، دفن کر دیا ہے۔

وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی، مگر نہیں رو سکی۔ سنعان شاہد کی اصلیت سامنے آنے کے بعد اسے اس کے تصور سے بھی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لمحے اس نے اپنے دل سے وہ سبھی دن، وہ سبھی سوچیں، وہ ساری یادیں، جو سنعان شاہد کے تصور سے وابستہ تھیں، کھرچ کر پھینک دیں۔ تین روز پہلے، جب اس نے دادی ماں سے سنی دادا کے بارے میں سنا تھا تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے سبق سکھا کر رہے گی، پوری قوت سے لڑے گی اس کے ساتھ، مگر یہ حقیقت بھی، اس پر ابھی ابھی منکشف ہوئی تھی کہ وہ ساری دنیا سے لڑ سکتی ہے، مگر سنعان شاہد سے نہیں، تبھی اس نے بیگی بلکیں پونچھ کر فوراً شہر واپسی کا فیصلہ کیا تھا کہ اسی پل رشید چاچا، روتے ہوئے، ان کے گھر چلا آیا۔ انزلہ تاحال کمرے میں بستر پر لیٹی تھی، مگر رشید چاچا کی بھیگی آواز بخوبی اس کی سماعتوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ نہایت دکھی لہجے میں دادی ماں سے کہہ رہے تھے۔

”میں تو برباد ہو گیا بھرجائی، اس ظالم سنی دادا نے کہیں کا نہیں چھوڑا مجھے.....“
”یا اللہ خیر! آخر ہوا کیا ہے رشید بھائی، کچھ کھل کر بتاؤ.....“ پکڑے بناتی دادی ماں نے، فوراً توجہ رشید چاچا کی جانب مبذول کر کے خالص دیہاتی لہجے میں پوچھا تھا۔ جب وہ کندھے پر پڑے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔

”کیا بتاؤں بھرجائی..... میں تو اس بار بڑا مطمئن تھا کہ فصل اچھی ہوئی ہے، بہت سے رکے ہوئے کام پورے کر لوں گا، اور جو قرضہ چڑھا ہوا ہے۔ وہ بھی اتر جائے گا، مگر کل رات ہی سنی دادا نے میری آدھی سے زیادہ فصل کٹوا کر اپنے قبضے میں کر لی ہے، میں نے رحم کی بھیک مانگی تو شدید غصے میں آ کر، باقی فصل میں آگ لگا دی.....“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد رشید چاچا پھر رونے لگے تھے، جب وہ مزید برداشت کا اختیار نہ رکھتے ہوئے فوراً کمرے سے باہر نکل آئی۔ رشید چاچا اسے دیکھ کر قطعی حیران رہ گئے تھے، مگر انزلہ نے ان کی حیرانگی پر مطلق توجہ نہ دیتے ہوئے، خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

”آپ فکر نہ کریں رشید چاچا، میں اس غنڈے سے آپ کے جائز پیسے دلوا کر

رہوں گی.....“

”نہیں انزلہ..... تو ہرگز اس ظالم کے منہ نہیں لگے گی، آج تو ویسے بھی تیرے دادا گاؤں میں نہیں ہیں، ہم کرتے ہیں کچھ نہ کچھ، تو جا، جا کر کمرے میں اپنا کام کر.....“ رشید چاچا اس کے یوں بے دھڑک باہر آکر بولنے پر، وہ ٹپٹا کر ہی تو رہ گئے تھے، مگر انزلہ شاہ نے ہمیشہ کی طرح، ان کے حکم پر قطعی سر نہیں جھکایا۔

”سوری دادی ماں، میں یہاں رہ کر، یہاں کے لوگوں پر، اس کے مزید ظلم برداشت نہیں کر سکتی.....“ قطعی حتیٰ لہجے میں کہنے کے بعد، وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی، تیز تیز قدم اٹھاتی قبرستان کے قریب، سنی دادا کے وسیع ڈیرے پر جا پہنچی تھی کہ وقت کے اس لمحے، اس کا دل دور دور تک سنعان شاہد کے تصور سے پاک تھا۔

آسمان پر چھائے گھنگھور بادل، کسی بھی پل برسنے کو بے تاب تھے۔ جب اچانک انزلہ شاہ کی نگاہ، کچھ ہی فاصلے پر کھڑے سنعان شاہد، کے لمبے چوڑے سر پاپے پر جا پڑی۔ وہ اس وقت نہایت مستی کے عالم میں گاؤں کی ایک سیدھی سادھی لڑکی کی راہ رو کے، اس سے بد تمیزی کر رہا تھا، جب غصے سے کھولتی انزلہ شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر، اس بے بسی لڑکی نے کلائی، سنعان شاہد کی مضبوط گرفت سے چھڑالی۔

”تم..... تم یہاں کیوں آئی ہو.....؟“ سنعان شاہد کی توجہ جنوبی اس کی سمت مبذول ہوئی۔ وہ شدید بھڑک اٹھا۔

”تمہیں چلتی پھرتی لڑکیوں کو چھیڑ کر بڑا مزہ آتا ہے، ناں، لو میں خود چل کر تمہارے پاس آگئی ہوں، کھیلو مجھ سے.....“ دیہاتی لڑکی کی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ واپس بھاگتے دیکھ کر، وہ خاصے کٹیلے لہجے میں بولی تھی، جب وہ شدید مشتعل ہو کر، اس کی طرف سے سُرخ پھیرتے ہوئے، چلا کر بولا۔

”بکواس بند کرو، اور جاؤ یہاں سے.....“

”کیوں جاؤں میں یہاں سے، بول.....؟ ہشتے بستے انسانوں کو رلا کر خوشی ہوتی ناں تمہیں، گاؤں کی ہر جوان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا تم اپنا حق سمجھتے ہوناں، تو لو، روند ڈالو مجھے اور میرے بوڑھے دادا دادی کو رلا کر خوشی سمیٹو تم.....“ وہ کہاں اس کے غصے سے خائف ہونے والی تھی، تبھی شاید سنی دادا نے ضبط سے منھیاں سمجھ کر، غصے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا چاہتی ہو تم..... بولو..... کیا چاہیے تمہیں.....؟“

”تم مجھے کیا دے سکتے ہو سنی استاد، تم تو صرف لینا جانتے ہو، پھر خواہ وہ کسی کی زندگی ہو، عزت ہو، یا عمر بھر کی پونجی.....“ اس بار انزلہ کا لہجہ قدرے شکستہ تھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو تم، اس سر پھرے ایلان جعفری کی.....؟ فار یور کاینڈ انفارمیشن میڈم، اسے میں نے نہیں مارا.....“ گرے کمر کے ڈھیلے ڈھالے کرتہ شلوار میں ملبوس، بڑی ہوئی شیو کے ساتھ، وہ اس وقت کتنا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی وہ سرد آہ بھر کر، نہایت مدہم لہجے میں بولی تھی۔

”میں ایلان جعفری کی موت کا سوگ نہیں منا رہی ہوں، ہم..... میں تو اس شخص کے زندہ دفن ہونے کے درد میں نڈھال ہوں سنعان شاہد، کہ جسے تم نے خود مار کر اپنے اندر ہی کہیں دفن کر لیا ہے.....“ یک لخت ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے، اور ان آنسوؤں میں پل دوپل کے لئے ہی سہی، اس کا عکس ڈوبا تھا، تاہم اگلے ہی پل وہ سر جھک کر، نگاہ پھیرتے ہوئے بولا۔

”تو تم مجھ میں کسی سنعان شاہد کا عکس ڈھونڈ رہی ہو، معاف کرو بی بی، یہاں اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔“ سرعت سے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا، اور نہ ہی اس نے پیچھے پلٹ کر، انزلہ شاہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تھی، مگر اس کے باوجود وہ پرسکون نہیں رہا تھا، ایک عجیب سی آگ اس کے پورے جسم کا احاطہ کر چکی تھی۔

جب کہ اس کے پیچھے نڈھال کھڑی انزلہ شاہ، ریت کی کمزور دیوار کی مانند، وہیں جیسے ڈھے سی گئی۔ بڑی، بڑی غزالی آنکھوں سے آنسو نکل کر گریبان میں پیوست ہو رہے تھے، بب اچانک کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور وہ چونک کر، سر اٹھاتے ہوئے آنے والے کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

میرے ہمسفر میرے چارہ گر

میرے درد کی تجھے کیا خبر

تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ

کئی موسموں میں بدل گیا

اے ناپتے اے کاٹتے، میرا سارا وقت نکل گیا

نہیں جس پہ کوئی نشان پا، میرے سامنے ہے وہ راہ گزر

میرے ہمسفر، میرے چارہ گر، میرے درد کی تجھے کیا خبر
یہ جو ریگ دشت فراق ہے
میرے رستوں میں پیچھی ہوئی، کسی موڑ پہ یہ رکے کہیں
یہ جورات ہے میرے چارو
مگر اس کی کوئی سحر نہیں
نہ ہی چھاؤں ہے نہ شمر کوئی
میں نے چھان دیکھا شجر، شجر
موبائل کان سے لگائے وہ بالکل ساکت کھڑا تھا اور دوسری طرف سحرش علی شاہ رو
رو کر بتا رہی تھی۔

”بھیا..... بھیا پلیز مجھے معاف کر دیں، بھیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے یوں گھر
سے چلے آنے پر، پاپا اپنی جان گنوا بیٹھیں گے، پلیز مجھے معاف کر دیں بھیا..... مجھے آج ہی پاپا
کے بارے میں معلوم ہوا ہے، آئی ایم ویری ڈیپریسڈ بھیا..... پلیز میرا یقین کریں، میں ایسا
کرنا نہیں چاہتی تھی، مگر اس کے سوا میرے پاس کوئی بھی راستہ باقی نہیں رہا تھا بھیا.....“
ہچکچایاں بھرتے ہوئے وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، مگر شانزل علی شاہ کے وجود میں اب
بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔

”بھیا..... میں ذیشان سے بہت پیار کرتی ہوں، اس کے سوا کسی اور کے ساتھ
زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں تھا میرے پاس، م..... مگر ذیشان نے میرا ساتھ نہیں دیا، اس
نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی بات مان لوں بھیا..... اس نے کہا کہ وہ گھر سے بھاگنے میں
میری مدد نہیں کر سکتا، اس نے مجھے بچ راہ میں اکیلا چھوڑ دیا تھا بھیا، اسی لئے میرے ذہن نے
کام کرنا چھوڑ دیا، میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کے حکم پر سر جھکا دوں بھیا، آپ کے پاؤں
پکڑ کر، آپ کو ذیشان کے لئے راضی کر لوں، مگر میں..... آپ سے بات نہیں کر
پائی، آپ..... آپ بہت خوش تھے اور میں آپ کی یہ خوشی چھیننے کا حوصلہ خود میں نہیں پا رہی
تھی..... مگر ذیشان کو ہمیشہ کے لئے کھودینے کا تصور، میری رگیں کاٹ رہا تھا بھیا، اندر ہی اندر
سمار کر رہا تھا مجھے، اسی لئے، میں نے اپنا دکھ، اپنی فرینڈ کے سامنے رکھ دیا، اور اس نے میری
حالت دیکھتے ہوئے، گھر سے نکلنے میں میری مدد کی اور اپنی بڑی بہن کے پاس دو بجی بھیجے کا
سارا انتظام کر دیا بھیا، آئی ایم سوری بھیا..... آئی ایم ریلی ویری سوری.....“ دوسری جانب وہ

ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی، تبھی جیسے شانزل علی، کے مردہ، وجود میں جان آئی،
اور اس کے سوائے حواس، ایک دم بیدار ہو گئے۔
”اب رونے سے کچھ حاصل نہیں سحرش، کیونکہ اپنی شادی کے دن، عین نکاح کے
وقت، گھر سے، بھاگتے ہوئے، تم نے اپنے باپ اور بھائی کی قبروں کو عبور کر کے باہر کی دہلیز کا
راستہ پایا تھا۔ اب یہاں تمہاری واپسی کے لئے کوئی دروازہ نہیں کھلا۔ ڈیڈ کو سپرد خاک کر دیا ہے
میں نے، اور تمہارے لئے بھی رو پیٹ کر صبر کر چکا ہوں میں، لہذا اب تم بھی دل کو یہ سمجھا کر بہلا
لو، کہ پیچھے جو تمہارا ایک غیرت مند بھائی تھا، جو تمہیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا تھا، وہ زندہ
دفن ہو چکا ہے سحرش، اب یہاں کے موسموں میں، تمہاری کوئی یاد، کوئی خیال باقی نہیں رہا.....“ نہ
چاہنے کے باوجود بھی اس کا لہجہ رندہ گیا تھا۔ تبھی وہ دوسری طرف تڑپتے ہوئے بولی۔

”خدا کے لئے ایسا مت کہیں بھیا، سحرش مر جائے گی۔ بھیا میں.....“

اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی، شانزل علی شاہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ نگاہوں میں
اندر تک دھول اڑ رہی تھی، پل دوپل کے لئے چند نمکین پانی کے قطرے، پلکوں پر آ کر اٹکے
تھے، جنہیں اس نے فوراً ہتھیلی کی پشت سے رگڑ ڈالا تھا اور عین اسی اثناء میں اس کی نگاہ اس
برف ہوئی، لاغری لڑکی پر پڑی تھی جو ابھی کچھ لمحے قبل، بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔

خوبصورت گلاب سا چہرہ، لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا، ہاتھ پاؤں ایک دم سے اکڑ
گئے تھے، سینے میں سانس کی رفتار بھی بہت مدہم تھی، گلابی ہونٹ اس وقت نیلے ہو رہے تھے،
سفید دودھیا بدن پر زیب تن اس کے کپڑے میلے ہونے کے ساتھ، اکثر جگہوں سے پھٹ بھی
چکے تھے۔ اس وقت اس میں زندگی کی کوئی رقت، پچھل چماتی دکھائی نہیں دے رہی تھی، تبھی وہ
گھٹنوں کے بل بیٹھ کر، اس پر جھکا تھا، مارے شرمندگی اور بچھتاوے کے، وہ خود اپنے آپ
سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ خوبصورت سی پاکیزہ، نازک مزاج لڑکی، جو ہر طرح
سے قطعی بے قصور تھی، کس کس طرح سے اس کے ظلم کا شکار ہوئی تھی، پچھلے پانچ دنوں سے، اس
نے، اس معصوم سی لڑکی کو، کھانے کے لئے روٹی کا ایک نوالہ بھی نہیں دیا تھا۔ لوگ جو سلوک،
کسی بے زبان جانور کے ساتھ بھی نہیں کرتے، وہ سلوک اس نے نہایت بے رحمی کے ساتھ،
ایک جیتی جاگتی، باشعور لڑکی کے ساتھ کیا تھا۔

اس وقت اسے اپنا ہر گناہ، ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے رقص کرتا دکھائی
دے رہا تھا۔ اسے کڈنیپ کرتے وقت، اس نے جس بے دردی سے اس کا بازو نوچا تھا اور اس

وہ ایک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات جو میں تم سے کہہ سکا ہی نہیں
وہ ایک ربط جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب، جو کبھی ہوا ہی نہیں
اگر یہ حال ہے دل کا تو کوئی سمجھائے
کہ تم کو بھولنا چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں

وہ قدرے ڈسٹرب ہو کر چند قدم ہی آگے بڑھا تھا، جب اس نے اپنے منہ کی لپٹائی
ہوئی آواز سنی۔

”ارے..... سنی دادا کے ڈیرے پر، پھر ایک بلبل آنسو بہا رہی ہے، کیا ہوا ہے
جان، کیا تم بھی اپنا سب کچھ سنی دادا پر لٹا بیٹھیں.....“
اپنے منہ کی انتہائی گھٹیا الفاظ پر اس نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر پیچھے دیکھا
تھا، جہاں وہ زمین پر بیٹھی چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی اور اس کے منہ مابے کا ہاتھ، اس کے
کندھے پر پڑا تھا، پل دوپل کے لئے اس کے پورے بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔
شدید ضبط کے عالم میں مٹھیاں بھیجنے کر، تیز تیز قدم اٹھاتا، وہ واپس پلٹا، اور انزلہ کے قریب پہنچ
کر، ایک زوردار تھپڑ اپنے منہ کی گال پر رسید کر دیا۔

”خبردار، جو آئندہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا کسی نے، ایک ایک کی
آنکھیں نکال لوں گا میں، سمجھے.....؟“ شدید غصے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی
تھیں، کشادہ پیشانی پر کتنی ہی شکنیں ابھر آئی تھیں۔ تبھی اس کے منہ مابے نے بائیں گال پر ہاتھ
رکھ کر، پھٹی حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے
ہوئے ”جی استاد“ کہہ کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ کتنی عجیب بات ہو گئی تھی آج، کہ استاد نے ایک
لڑکی کے لئے، اسے تھپڑ دے مارا تھا۔ جب کہ اس سے قبل تو وہ ہمیشہ لڑکی پر ہاتھ صاف
کرنے کے بعد، اسے بھی تھوڑی سی ”عیش“ کی اجازت ضرور دے دیا کرتا تھا۔

ایسے ہی ہمیشہ اس کی ہمت بڑھتی رہی تھی، اور اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ
سنی دادا کے ساتھ ساتھ، وہ خود نہیں بھی، کسی لڑکی کو گھیر لیتا تھا۔ پھر بعد میں اگر کوئی مسئلہ درپیش
آتا، تو سنی استاد خود ہی اس کا سامنا کر لیتے تھے، تبھی تو اس کے حوصلے بڑھے تھے، مگر آج.....

کے شور مچانے پر، جیسے جاندار تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کیا تھا، پھر اس کی بے ہوشی کے
دوران، جس انداز سے اس نے، اس کی اخلاق سوز تصاویر لیں تھیں، پھر اس کے چلتے وجود پر رحم
کئے بغیر جس طرح سے اسے ٹھنڈا بخ پانی، پینے کو دیا تھا اور بعد میں اصطبل کی صفائی کے دوران،
کیسے اس نے بیلٹ اتار کر، شدید اشتعال میں، اس کی کمزور حالت کی پرواہ کئے بغیر اسے دھنک
کر رکھ دیا تھا، آج سب یاد آ رہا تھا اسے، اور وہ جیسے پشیمانیوں کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔
نازک سا بدن جا بجا، اس کی حیوانیت کے نشانات سے اٹا پڑا تھا، اور وہ اس کو سینے
سے لگا کر جیسے سسک کر رہ گیا۔

”آئی..... آئی ایم سوری اچھی لڑکی، آئی ایم سوری.....“

آنسو لٹاتی نگاہوں سے اس کی بند پلکوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا، اور
اگلے ہی پل اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر باہر کی طرف دوڑ پڑا، اس کی پوری زندگی میں، ڈیڈی
کے بعد، یہ دوسرا شاک تھا کہ جس نے اس کے دل کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ برقی نگاہوں سے
ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی وہ مسلسل اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا تھا۔ جانے یہ،
کون سا احساس تھا کہ اسے سبعین الہدیٰ کی اگلی سانسوں کے ساتھ، اپنا چلتا دھڑکتا دل، رکستے
ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔

باپ کے بعد، دوسری مرتبہ وہ بانہوں میں سبعین الہدیٰ کو اٹھا کر دوڑتے ہوئے،
بدحواس دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی ریکویسٹ پر، فوراً سبعین الہدیٰ کا چیک اپ کر
کے، اسے آئی سی یو میں ایڈمٹ کیا تھا اور اب وہ قطعی دل گرفتگی کے عالم میں، آئی سی یو کے باہر
کھڑا، سبعین کی زندگی اور اپنے دل کے دکھ پر بے بسی سے رو رہا تھا۔ اندر ڈاکٹر ز اپنی بھرپور
کوشش کر رہے تھے اور باہر وہ دونوں ہاتھ پھیلائے خدا کے حضور اس کی لمبی عمر اور صحت و سلامتی
کی دعا کر رہا تھا کہ جو انجانے میں ہی اس کے ہاتھوں اپنی زندگی گنوار ہی تھی۔

☆☆☆

میں بھول جاؤں تمہیں اب یہی مناسب ہے
مگر بھلا نا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں کجنت

بھلا سکا نہ یہ وہ سلسلہ جو تھا ہی نہیں

آج یہ عجیب بات ہو گئی تھی کہ فقط ایک معمولی لڑکی کے لئے، اس پر بے حد مہربان، اس کے سنی استاد نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ کیوں.....؟ ما بے نشی کی سمجھ میں، سوچ سوچ کر بھی یہ بات نہیں آرہی تھی اور ادھر وہ، سعان کے سامنے زمین پر بیٹھی، آنسو پونچھتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

”آہ سعان شاہد، تم تو اب مجھ سے پیار نہیں کرتے، پھر کیوں میرے کندھے پر، کسی اجنبی کا ہاتھ دیکھ کر، ضبط نہیں کر سکے..... بولو.....“

”بکواس بند کرو، اور جاؤ یہاں سے خبردار جو تم نے دوبارہ یہاں قدم رکھا تو.....“ اس کی کشیدہ پیشانی کی شکنیں کسی طور کم نہیں ہو رہی تھیں، جب وہ پھر سے آہ بھرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”مجھ پر ہی یہ خاص کرم کیوں سعان شاہد.....؟“

”کیونکہ..... کیونکہ تم ان اجڈ گاؤں والوں سے قطعی مختلف ہو.....“

”تم بھی تو مختلف تھے سعان..... تم بھی تو ان موالیوں جیسے نہیں تھے، پھر کیوں یہ روپ اپنا لیا تم نے؟“ عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے دوبارہ جواب دیتے ہوئے پوچھا تھا، جب وہ پھر سے مضطرب ہوا تھا۔

”تم یہاں سے جاتی ہو، یا میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ کر آؤں.....“

”وہ یونیورسٹی، وہ کتابیں، اور وہ تمہاری مقناطیسی نگاہوں کی تپش سے گھرائی گھرائی سی پھرتی، ایک سادہ سی لڑکی، یاد تو آئی ہوگی ناں تمہیں.....“ وہ اپنی ہی رو میں کھوئی ہوئی تھی، سعان شاہد کی بات جو جیسے اس نے سنی ہی نہیں تھی، تبھی اس نے بے بس ہو کر، اس کا بازو تھاما تھا۔

”چلو تم، آج ہی کہتا ہوں اس کریم بخش سے کہ تمہیں جلد سے جلد شہر بھجوا دے.....“

”سعان..... سعان میں نہیں جانتی کہ تم میرے سعان شاہد سے، سنی دادا کیوں بن گئے لیکن میں، جانتی ہوں کہ تم حیوان نہیں ہو، اب بھی تمہارے اندر، گوشت کا ایک جیتا جاگتا دل دھڑکتا ہے، اب بھی تم بدلتے موسموں کا حسن محسوس کرتے ہو، کوئی جانے نہ جانے، مگر میں جانتی ہوں کہ تم زندہ ہو.....“

”نہیں..... زندہ نہیں ہوں میں..... دیکھو میری ان آنکھوں میں، کبھی کسی زندہ انسان کی ایسی آنکھیں دیکھی ہیں تم نے، نہیں..... کبھی نہیں دیکھی ہوں گی، کیونکہ میری ان آنکھوں میں، ہزاروں تاریک راتیں، صدیوں سے پڑاؤ ڈالے بیٹھی ہیں، میری ان آنکھوں میں خوشی کے دیوں کی جگہ، ہمیشہ آنسوؤں کے چراغ جلے ہیں انزلہ..... خون لٹا لٹا کر دیران ہو گئی ہیں یہ..... کس زندگی کی بات کرتی ہو تم..... سانسوں کو گن گن کر پورا کرنے کا نام زندگی

نہیں ہوتا، سمجھی تم.....“ وہ اچھا خاصا بکھر کر رہ گیا تھا، جب انزلہ شاہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ، اس کے مضبوط کندھے پر دھر دیا۔

”اپنے سارے غم، ساری اذیتیں، سارے آنسو مجھے دے دو سعان، پلیز.....“ اس لمحے انزلہ شاہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ، کچھ ایسا تھا، کہ وہ اس کی نگاہوں سے اپنی نگاہیں چھڑا نہیں پایا تھا۔ پہلو میں اودھم مچاتے دل کے سوئے جذبات نے پھر سے سرا بھارا تھا، پھر سے نجانے کتنی ہی بے قابو تمنائیں برہنہ ہو کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ پھر سے اسے بے ساختہ، اپنی ڈائری میں پانچ سال پہلے انزلہ شاہ کے نام لکھی یہ غزل یاد آئی تھی۔

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو
بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے کوئی شام ادھار دو
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں میرے خدو خال
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، میرے سارے زنگ اتار دو
کسی اور کو میرے حال سے، نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ دو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو
میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے، جدائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا، میری دھڑکنوں کو قرار دو
تمہیں صبح کیسی لگی کہو، میری خواہشوں کے دیار کی
جو اچھی لگی تو یہیں رہو، اسی چاندنی میں گزار دو

مگر اس نے پھر اپنا چندار بچالیا، دل میں اودھم مچاتے جذبات کو نیکیل ڈال کر، تیزی سے رخ پھیر لیا۔ عرصے میں دل میں مقید خواہشوں کو پھر سے ڈپٹ کر چپ کر دیا، کیونکہ اب وہ سعان شاہد نہیں رہا تھا۔ ”سنی استاد“ ہو گیا تھا۔ ان راستوں پر چل پڑا تھا کہ جہاں قدم قدم پر کانٹے بکھرے تھے، ہر نئے موڑ پر زندگی موت سے ہاتھ ملائی تھی، لہذا ایسی پرخطر راہ گزر پر، وہ اسے اپنا ہمسفر نہیں بنا سکتا تھا تبھی قدرے ترش لہجے میں بولا۔

”مجھے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسانے کی کوشش مت کرو، تم جیسی نجانے کتنی لڑکیاں، میرے بانهوں کی زینت بن چکی ہیں۔ یہ پیار و یار کی پٹی نہ پڑھاؤ مجھے، اب جاؤ یہاں سے.....“ کن اکھیوں سے اس نے دیکھا تھا کہ انزلہ شاہ کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ، خود اس کی اپنی شخصیت کا غرور بھی ٹوٹ کر بکھرا تھا، تبھی وہ بائیں ہتھیلی سے، اپنے آنسو رگڑتے

ہوئے، شکستہ لہجے میں بولی۔

”اوکے..... چلی جاتی ہوں میں، مگر پلیز سنعان، رشید چاچا پر جو ظلم تم نے ڈھایا ہے، اس کا ازالہ کر دو، وہ بہت زیادہ غریب انسان ہیں، جو فصل ان کی تم نے تباہ کی ہے اس فصل سے ان کی بہت سی خوشیاں جڑی تھی، میں جانتی ہوں، تمہارے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہے، لہذا، اگر تمہارے دل میں ذرا سی بھی میرے لئے کوئی جگہ اگر کبھی رہی ہے، تو تمہیں اسی احساس کا واسطہ سنعان، رشید چاچا کے نقصان کا ازالہ کر دو، میں زندگی میں پھر کبھی تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔“

جھلملاتی نگاہوں کے آنسو پیتے ہوئے اس نے، نہایت مدہم لہجے میں اپنی بات مکمل کی، پھر کچھ پل خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد، وہ وہاں سے چلی آئی، جب کہ اس کے پیچھے کھڑا سنعان علی شاہد دور تلک دھواں دھواں نگاہوں سے، اس کے اٹھتے ہوئے شکستہ قدموں کو دیکھتا رہ گیا۔

میری زندگی کے چراغ کا یہ خراج کچھ نیا نہیں
کبھی تیرگی، کبھی روشنی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا
میرے گوشہ فکر میں مری جان سے بھی عزیز تر
میرا ایک ایسا بھی دوست ہے، جو کبھی ملا نہ جدا ہوا
انزلہ شاہ، اب اس کی نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل ہو گئی تھی، مگر اس کے باوجود، وہ وہیں، کھڑا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کھڑکیوں کے شیشوں پر
ریختے ہوئے قطرے
یوں بھسلتے ہیں جیسے، میرے اور بادل کے
درمیان کوئی ہے
جو میرے اور بادل کے راز کو سمجھتا ہے
جب گھٹائیں چھائیں تو
صرف وہ نہیں روتیں
آنکھیں بھی برستی ہیں

کھڑکیاں بھی روتی ہیں

آئی۔ سی۔ یو کے باہر کھڑا، وہ خلوص دل سے سبعین الہدیٰ کی زندگی کے لئے دعائیں کر رہا تھا، جب دو گھنٹے کے طویل وقت کے بعد، ایمر جنسی وارڈ کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر تھکے سے چہرے کے ساتھ، وارڈ سے باہر آیا۔ ڈاکٹر کو باہر نکلتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب وہ..... وہ..... سبعین الہدیٰ.....“

”سوری یگ مین، وی ٹرائے ٹو بیسٹ، بٹ شی ہیڈ گون ان کوما، بی کا ز آف مور مینٹلی پریشر.....“ ڈاکٹر کے الفاظ کیا تھے، کوئی ہم تھا جو اس کے بالکل قریب بلاسٹ ہوا تھا، اور وہ اس بلاسٹ میں، اپنی روح سمیت بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

ک..... کیا وہ اب آنکھیں نہیں کھولے گی.....“ اس لمحے اسے خود اپنی آواز، گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، تبھی ڈاکٹر نے اس کے زرد پڑتے چہرے کی جانب افسوس سے دیکھتے ہوئے، قدرے پر امید لہجے میں کہا۔

”بے شک ان کی حالت قدرے سیریس ہے، مگر خدا کا کرم ہوا تو وہ ضرور زندگی کی طرف واپس لوٹ آئیں گی مسٹر شاززل، فی الحال، ابھی ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، کہ وہ زندہ رہیں گی یا نہیں، تاہم خدا سے اچھی امید رکھئے، ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی دعائیں، اور ہماری محنت رنگ لے آئے.....“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد، ڈاکٹر وہاں ٹھہرا نہیں تھا، مگر شاززل علی شاہ کی زندگی میں خزاں ضرور ٹھہر گئی تھی، اس کا جنون اتنی بڑی تباہی لائے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب کیسے سامنا کرے گا وہ اس کے گھر والوں کا، کیا کہے گا ان سے.....؟ اپنی اس درندگی کا کیا جواز پیش کرے گا ان کے سامنے، کیا کہے گا کہ اس نے محض غلط فہمی کی بناء پر سبعین الہدیٰ کو کڈ نیپ کر کے، اس کا یہ حال کر دیا.....؟

”اف..... وہ تو شاید یہ گمان بھی نہ کر سکتے ہوں کہ ان کے آشیانے پر بجلی گرانے والا، کوئی اور نہیں، میں ہوں، او مائی گاڈ، یہ کیا ہو گیا مجھ سے، کیوں اتنا اندھا ہو گیا تھا میں کہ حقیقت کی تحقیق بھی نہ کر سکا اور لے کر ایک معصوم لڑکی کی ہنستی کھیلتی زندگی کو، آفتوں کی گود میں دھکیل دیا، وائے.....؟“ شدید اضطراب کے عالم میں اپنے بال نوچ کر، وہ چلا دیا تھا، مگر اس کے یوں چلا دینے سے بھلا سبعین الہدیٰ کی بند ہوئی پلکیں کہاں کھلتی تھیں۔

لمحے گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں اور دن ہفتوں میں ڈھل گئے تھے، مگر سبعین الہدیٰ

کی حالت میں ذرا سی بہتری بھی نہیں آئی، اس کے نازک بدن پر درندگی کے جو نشانات اس نے اشتعال کے عالم میں ثبت کئے تھے، وہ کسی حد تک مندمل ہو چکے تھے، مگر اس کی پلکیں بدستور بند تھیں۔

زندگی کا حسن ایک دم سے جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہنسنا بولنا، کھانا پینا، سب بھول چکا تھا وہ، سبوعین الہدیٰ کی ٹریڈی کے سامنے، اس کے ڈیڈ کی وفات کا غم، کافی کم پڑ چکا تھا۔ صبح نو بجے بیدار ہو کر بناء ناشتہ کئے آفس جانا، اور لنچ ٹائم کے وقت اٹھ کر سبوعین کو دیکھنے کے لئے ہاسپٹل چلے آنا، پھر دو تین گھنٹے مزید آفس میں گزار کر، رات دیر تک سبوعین کے بیڈ کے پاس بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہنا ہی اب اس کے روز کا معمول بن چکا تھا۔

سبوعین کی جدائی کے دکھ میں، اس کے پاپا کرنل خالد رحمانی بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور ان کی ڈیوٹی کے بعد تو وہ مزید پشیمانیوں کی دلدل میں دھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ سبوعین کے گھر والوں کو اس کے بارے میں کیسے انقارم کرے، وہ جو پہلے ہی اذیتوں سے نڈھال تھے۔ ان کے کندھوں پر کیسے، ایک اور اذیت کا بوجھ ڈال دے.....؟ دن رات یہ سوچ سوچ کر، وہ جیسے خود پاگل ہونے کو تیار ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی شام کے دھندلکے گہرے ہو رہے تھے اور وہ دنیا جہان سے بے خبر بیٹھا، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے، دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔
”سبوعین..... خدا کے لئے آنکھیں تو کھولو..... میری ان آنکھوں میں مچلتے پشیمانی کے آنسو تو دیکھ لو..... پھر چاہے تم مجھے میری زندگی سے دور کر دینا، مگر پلیز..... صرف ایک بار کہہ تو دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا.....“

پچھلے تین ماہ میں اس نے پانی کی طرح پیسہ بہا دیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا، سبوعین کا مہنگا ترین علاج ہو رہا تھا، مگر شانزل علی شاہ کو اپنے پیسوں کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے ہر قیمت پر، کسی بھی طرح سے سبوعین کی زندگی چاہیے تھی۔ اس کی سوچوں، اس کی یادوں اور خیالات میں ہمہ وقت سبوعین الہدیٰ کا گزر تھا، بہت ممکن تھا کہ اس کٹھن وقت میں وہ خود بھی ٹوٹ کر بکھر جاتا، جو اگر زویا خان اس کی زندگی میں نہ آتی۔ قدرے پھیلے نقوش اور سنہری رنگت والی بے حد پرکشش سی، پر اعتماد زویا خان، اس کی پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے اپائنٹ کی گئی تھی۔ اپنی محنت اور قابلیت سے بہت جلد اس نے، شانزل علی شاہ کی کمپنی میں نہ صرف اپنا مقام بنا لیا تھا، بلکہ اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر اس نے شانزل علی شاہ کے ڈوبتے

برنس کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ کتنے ہی ایمپورنٹ کانٹریکٹ تھے جو اس نے محض اپنی ذہانت کے بل بوتے پر حاصل کئے تھے۔

اسے شانزل علی شاہ کی کمپنی کے کام کرتے ہوئے اڑھائی ماہ ہونے کو آئے تھے اور ان اڑھائی ماہ میں اس نے کبھی شانزل علی شاہ کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کے برعکس وہ اس کی غیر موجودگی میں، خود اس کی ذمہ داریاں، بخوبی سرانجام دیتی اور یوں شانزل علی شاہ کی توجہ آفس سے قدرے ہٹ گئی تھی۔

اس روز بھی وہ سبوعین کو دیکھ کر ہاسپٹل سے آیا، تو بے حد نڈھال تھا، تھکن اس کے چہرے سے بخوبی عیاں ہو رہی تھی، اسے شدت سے کسی ایسے دوست کی کمی محسوس ہو رہی تھی کہ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے دل پر، گرتے سارے آنسو بہا سکتا۔ اپنے دل کا بوجھ، جس کی سماعتوں کے سپرد کر کے پرسکون۔ کوئی ایسا دوست جو اس کے سارے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ کر، اسے راحت فراہم کرنا، تسلی اور حوصلہ دیتا۔

اور زویا خان کی صورت میں ایسی دوست، اسے میسر آ گئی تھی، اس روز وہ، شانزل کو نڈھال دیکھ کر اس سے پوچھتے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیا بات ہے سر..... میں روز دیکھتی ہوں کہ آپ خالی آنکھیں لئے، باقاعدگی سے کہیں جاتے ہیں اور ان آنکھوں میں آنسو لے کر واپس آ جاتے ہیں، کیا آپ کا درد، اتنا گھمبیر ہے کہ دل وادی میں بھی نہیں سما پا رہا.....“ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ شانزل علی شاہ، نے فوراً چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”مجھ سے کہیے ناں کہ کیا دکھ ہے آپ کو، ہو سکتا ہے میں آپ کے درد کا مرہم فراہم کر سکوں.....“ اسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر، اس نے پھر پوچھا تھا اور ساتھ ہی گرم چائے کا ایک کپ لا کر اس نے سامنے دھر دیا۔ مگر شانزل علی شاہ کے ہونٹ، اب بھی ایک دوسرے میں پیوست تھے، وہ اب بھی، اضطراب کے عالم میں، کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

”کوئی لڑکی ہے ناں آپ کی زندگی میں، جو آپ کو حاصل نہیں ہو رہی، ہے ناں.....“ روشنی لٹاتی خوبصورت نگاہیں بغور شانزل علی کے ستے ہوئے چہرے پر جما کر، وہ پھر سے جبکی تھی اور شانزل کے چونک کر دیکھنے پر، قدرے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”آپ مرد لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہو شانزل صاحب، آخر تک پتہ نہیں چلنے

اس نے سر آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ضروری نہیں ہے کہ آپ کو یہ حقیقت عیاں کرنے کے لئے، ان کا سامنا کرنا پڑے، آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے محض ان کی بیٹی کی مدد کی ہے، اسے کسی سے آزاد کروا کر، ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانے کی نیکی کی ہے۔ یہ وقتی جھوٹ فی الحال آپ کو سنبھلنے میں مدد دے گا، پھر اس طرح آپ ان کے گھر والوں کے سامنے بھی ان سے مل سکتے ہیں.....“

”ہاں..... مگر میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہا.....“ وہ قدرے پریشان ہوا تھا۔

”راہیٹ مگر آپ کا دل بھی تو ابھی اسے نگاہوں سے اوجھل کرنے کی اجازت نہیں دے گا آپ کو، پھر دل اور دماغ کی اس جنگ میں، اگر دل کی جیت ہو جاتی ہے تو حرج ہی کیا ہے۔ ہاں جب وہ ہوش میں آجائیں گی، تو پھر، سارا معاملہ خود ہی کھل جائے گا، تب تک ہو سکتا ہے کہ بہتری کے مزید مواقع میسر آجائیں.....“ شانزل نے پرسوج گہری نگاہوں سے کچھ پل اس کی سمت دیکھا تھا، پھر گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”سینے..... کیا میں اس خوش نصیب لڑکی کا نام جان سکتی ہوں۔ جسے آپ کے دل میں اترنے کا اعزاز حاصل ہوا.....“ اس کے گز ادبوں پر مخصوص مسکراہٹ بکھری، تاحال نظر آ رہی تھی۔ تبھی وہ مشکور نگاہوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑایا۔

”اس بد نصیب کا نام سعین الہدیٰ ہے۔“ کہنے کے ساتھ اس نے ہچکچاہٹ اور موبائل اٹھایا اور زویا خان کی طرف دیکھ بھیر، ست قدموں سے چلتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پھر دن تیری یادوں کی منڈیروں پہ گزارہ
پھر شام ہوئی آنکھ سے، آنسو نکل آئے
پھر دل نے کیا ترک تعلق کا ارادہ
پھر تجھ سے ملاقات کے پہلو نکل آئے

وہ سہان علی شاہ سے مل کر آئی تو بے حد غمگین تھی۔ دادی ماں نے متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر قدرے پریشان لہجے میں بولیں۔

”کیا ہوا انزلہ پتر، کہا تھا ناں، مت منہ لگ اس حیوان کے، کسی کی نہیں سنتا ہے وہ، مگر تو بھلا مانتی ہی کہاں ہے کوئی بات.....“ وہ قدرے دھکی دکھائی دے رہی تھیں، جب انزلہ

دیتے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اور ادھر ہم عورتیں..... ہیں..... آپ لوگوں کی محض ایک گہری نگاہ کے سامنے، کھل کر روز روشن کی مانند عیاں ہو جاتی ہیں، خیر محبت کا جو درد اس وقت آپ کی نگاہوں میں تیرتا دکھائی دے رہا ہے۔ کہیں اس میں کسی پشیمانی کا گزر تو نہیں، یہ اضطراب جو آپ کے چہرے ہوئے آنسوؤں سے چھلک رہا ہے، کہیں آپ کی کسی کوتاہی کا اظہار تو نہیں.....“ کیسی گہری نظر شناس تھی وہ..... شانزل علی شاہ، واقعی اس کی ذہانت کا قائل ہو کر رہ گیا تھا۔

”میں اس سے محبت نہیں کرتا..... محض اسے کھودینے کا درد محسوس کر رہا ہوں.....“ چائے کا پہلا گھونٹ بھر کر، اس نے جیسے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ تبھی وہ پھر سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کمال ہے۔ آپ اس سے محبت بھی نہیں کرتے، اور اسے کھودینے کے درد سے نڈھال بھی ہیں.....؟“ شانزل علی شاہ کو اس وقت زویا خان کی ہنسی، بہت ناگوار گزری تھی، مگر پھر بھی وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا تھا۔

”کیسی ہے وہ، کیا بے حد حسین ہے.....؟“

”شاید ہاں..... یا شاید نہیں..... میں نے کبھی اسے خوبصورتی کی نظر سے نہیں دیکھا.....؟“

”تو پھر..... وہ درد بن کر آپ کی آنکھوں میں کیوں بٹھی.....؟“ آج وہ گویا اسے پرت در پرت کھولنے پر بندھتی۔ اس کے سوال پر، وہ محض چند لمحوں کے لئے ڈسٹرب ہوا تھا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔

”میں نے اس پر بہت ظلم کیا ہے، میرے ظلم کی وجہ سے وہ اس وقت، کسی بے جان گڑیا کی مانند زندگی سے دور جا رہی ہے، ڈاکٹر زاس کی زندگی کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں ہیں، مزید ستم کہ میں اس کی فیملی کو بھی اس کے بارے میں باخبر نہیں کر سکتا.....“ شانزل علی شاہ کے مضطرب لہجے سے کرب چھلک رہا تھا، تبھی وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

”یہ تو واقعی خاصی ٹریجک سنواری ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، آپ کو اس کی فیملی پر تمام حقیقت ضرور کھول دینی چاہیے.....“

”ہاں..... میں نے بھی اس بارے میں بہت سوچا ہے، مگر نجانے کیوں، میں ان کا سامنا کرنے کی، خود میں ہمت نہیں پا رہا.....“ وہ پھر سے قدرے مضطرب ہو کر بولا تھا، جب

نے سرعت سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”وہ حیوان نہیں دادی ماں، محض بھٹکا ہوا راہی ہے، ضرور اس کی زندگی میں ایسا کچھ ہوا ہے کہ وہ اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے، کہیں نہ کہیں ضرور کسی سے تکلیف پہنچی ہے اسے، ضرور زندگی نے کہیں گہرا گھاؤ لگایا ہے اس کے دل پر.....“ وہ کیا بول رہی تھی، کیا کہہ رہی تھی اسے خود بھی خبر نہیں تھی۔ تبھی شاید دادی ماں نے بے حد حیران نگاہوں سے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”انزلہ..... تو ٹھیک تو ہے ناں پتر.....؟“

”پتہ نہیں دادی ماں..... I do not know, about my self.“

بے حد گھمبیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ چار پائی پر بیٹھ گئی تھی کہ اسی لمحے، بے حد مسرور رشید چاچا، خوشی سے کانپتے ہوئے وہاں چلے آئے۔

یقیناً دادی ماں نے انہیں، انزلہ شاہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔

”مبارک ہو بھر جائی..... مبارک ہو.....“ خوشی ان کے انگ انگ سے ظاہر تھی، تبھی دادی ماں پھر سے حیران ہوا انہیں۔

”کیا بات ہے رشید بھائی، آپ تو بڑے مسرور دکھائی دے رہے ہیں.....“

”ہاں بھر جائی، بات ہی کچھ ایسی ہے، نجانے انزلہ بیٹی نے کیسا جادو کیا ہے، کہ وہ ظالم سنی استاد، خود میرے دروازے پر آ کر، مجھے میری فصل کی قیمت دے کر گیا ہے، یہ تو معجزہ ہو گیا بھر جائی، یہ تو معجزہ ہو گیا.....“ رشید چاچا واقعی بہت خوش دکھائی دے رہے تھے، مگر اس لمحے تو خود اس کی دادی ماں بھی جہاں کی، تہاں کھڑی رہ گئی تھیں۔

”واقعی..... یہ معجزہ کیسے ہو گیا.....؟ سچ بتا انزلہ، کیا بات ہوئی ہے سنی دادا سے تیری.....“ وہ جہاں خوش ہوئی تھیں، وہیں ایک عجیب سے شک نے بھی انہیں پریشان کر ڈالا تھا، تبھی انزلہ نے اعتماد سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے، دھیمے لہجے میں کہا۔

”وہ محض آپ کے اور گاؤں والوں کے لئے سنی دادا ہے دادی ماں، میرے لئے وہ سعان علی شاہد ہے، جس نے میری ہی یونیورسٹی سے، انتہائی اعلیٰ نمبروں کے ساتھ، ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا تھا، ہر کسی کا چہیتا تھا وہ، ہر ایک کے لبوں پر اس کے لئے محض دعائیں تھیں، بس اسی سعان علی شاہد کے پاس گئی تھی میں، اسی، سعان علی شاہد کو اپنی دوستی کا واسطہ دے کر، رشید چاچا کی غربت کا احوال سنایا تھا میں نے، اور وہی سعان علی شاہد، رشید چاچا کو ان کے پیسے واپس کرنے آیا ہوگا دادی ماں، یقیناً وہی آیا ہوگا.....“ اس وقت وہ خود جتنی

اداس تھی، اتنا ہی اس کا لہجہ پر غم تھا۔

دادی ماں شاکد نگاہوں سے اس کی سمت تک رہی تھیں، جب کہ چاچا کی نگاہوں میں اس کے لئے ستائش تھی، آج واقعی سعان علی نے اس کی ریکویسٹ کا مان رکھ کر، اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا، مگر وہ، اس بڑے احسان کے بدلے بھی، اسے ”ایلان جعفری“ کا خون معاف نہیں کر سکتی تھی، عجیب کیفیت ہو رہی تھی، اس کی، دو پاٹوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا تھا اس کا دل، ایک طرف وہ اگر اس بھٹکے ہوئے راہی کو، راہ راست پر لانے کی خواہاں تھی، تو دوسری طرف اس کا دل اس کے ظلموں کی روداد سن کر، اس سے بے حد متنفر ہو چکا تھا، وہ اسے سزا دینا چاہتی تھی، تڑپانا چاہتی تھی۔ اسے موسموں کے حسن کا احساس کرانا چاہتی تھی، اور اس کے لئے، بے حد ضروری تھا کہ وہ اسے انسانیت کے دائرہ کار میں واپس لاتی، کیونکہ ہوش مندی کے پریڈ میں چوٹ لگانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

دفور کرب کی شدت میں ضبط کیا کرتے

نگاہ سے اشک نہ بہتے تو اور کیا کرتے

رہ طلب کے تقاضوں سے آشنا ہی نہ تھے

نماز عشق و گرنہ نہ ہم، قضا کرتے

نظام جو وقت پر چلتا اگر ہمارا، بس

تمام عمر نہ دل سے اسے جدا کرتے

وہ میرے شہر تکلم میں گر ٹھہرتا تو

بیان ہم بھی اس سے دل کا مدعا کرتے

یقیناً تم راہ راست سے بھٹکے ہوئے راہی ہو سعان علی شاہد، یقیناً تمہارے اندر، آج بھی زندگی کا احساس دھڑکتا ہے۔ تم نے اپنے اندر کے اچھے انسان کو مار کر، خود اپنے ہی دل کے مقبرے میں دفن تو کر لیا ہے سعان، مگر زندہ تو تم بھی نہیں ہو..... ہاں میں تمہیں زندگی کی طرف واپس لاؤں گی، تمہیں، بدلتے موسموں کے حسن سے آشنا کراؤں گی میں، مگر..... اس کے لئے تمہیں پھر سے مرنا ہوگا سعان علی شاہد، پھر سے مرنا ہوگا تمہیں.....“ اپنے ہی آپ میں غم وہ دھیرے دھیرے بڑبڑاتے ہوئے رو رہی تھی، جب پھر سے ایلان جعفری، لبوں پر دھیمی مسکان لئے، اس کے تصورات سے باہر نکل کر، اس کے عین مقابل آ بیٹھا۔

”ہیلو اداس لڑکی..... کیا آج پھر اس سعان علی شاہد کے یونیورسٹی نہ آنے پر اداس

زیست ہے شمع کی مانند، ہوا کی زد پر
بس سلگتی ہے کسی حال میں جلتی ہی نہیں
کشتیاں ڈوب رہی ہیں، یہ ہے اس کی مرضی
یہ ہوا ہے کہ میری راہ پر، چلتی ہی نہیں
زیست بکھری ہوئی رہتی ہے میرے جذبوں میں
جانے کیا بات ہے احساس میں ڈھلتی ہی نہیں
ہم گزرتے ہوئے لمحات میں گم رہتے ہیں
زندگی ہے کہ کبھی، راہ بدلتی ہی نہیں
پھر بھی یہ جیسی ہے، ہر حال میں کاٹیں گے اسے
موت آتی ہے کسی در پر تو ٹلتی ہی نہیں
دل کی حالت یہ کسی طرح سنہلتی ہی، نہیں

الشفاء ہسپتال کے کمرہ نمبر ۳۲ میں سفید بستر پر پڑی وہ خوبصورت سی لڑکی اب بھی
دنیا و مافیہا سے قطعی بے خبر تھی کہ اچانک ذیشان رحمانی نے وہاں قدم رکھا۔

کتنے دن ہو گئے تھے آج اسے دیکھے ہوئے، اس نے تو اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ
شاید وہ زندہ ہی نہیں رہی، مگر یہاں، ہسپتال کے پُر سکون کمرے میں، بستر پر پڑے اس کے
ساکت وجود کو دیکھ کر، غڈ حال دل کو ذرا سی تسلی ملی تھی، شانزل علی شاہ کی ہمراہی میں، کمرے کی
دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے لپک کر اس کی سمت بڑھا تھا۔
”گڑیا..... گڑیا آنکھیں کھولو ناں..... دیکھو میں آ گیا ہوں، آنکھیں کھولو ناں،

پلیز.....“

سفید بستر پر پڑی سنعین الہدیٰ کے سر دگال تھپتھپاتے ہوئے، وہ اچھا خاصا
جذباتی ہو گیا تھا، جب دائیں طرف خاموش کھڑے شانزل علی شاہ نے تیزی سے لپک کر اس
کو تھام لیا۔

”ہوش میں آؤ ذیشان، اگر وہ ہماری آواز سننے کی پوزیشن میں ہوتی، تو اب تک کب
کی آنکھیں کھول چکی ہوتی.....“

”شان..... تم نے میری بہن کو یہاں لا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے، اب خدا
کے لئے پلیز اس کے مجرم کو ڈھونڈنے میں بھی میری مدد کرو، م..... میں اس کینے کو سرعام

ہو.....؟“ نجانے وہ کیسے اس کے دل کا بھید پا گیا تھا، حالانکہ یہ راز تو ابھی بھی اس نے خود
اپنے آپ پر بھی منکشف نہیں ہونے دیا تھا مگر وہ کتنی آسانی سے اس کے اندر تک اتر کر، اس
کے سارے سیکریٹ جان گیا تھا۔

”آف، پتہ نہیں اس سٹری مرچ میں کیا نظر آ گیا ہے تمہیں، جو نگاہوں کے سامنے
بیٹھے اتنے پیارے سے ہینڈسم بندے کو نظر انداز کر رہی ہو، لگتا ہے واقعی تمہاری قریب کی نظر کمزور
ہو گئی ہے.....“ اس کا لہجہ ہمیشہ فریش رہتا تھا۔ تبھی وہ گھور کر اس کی سمت نکلتے ہوئے بولی تھی۔

”اچھا..... ہینڈسم جی، اگر میں آپ کا پیار قبول کر لوں، تو ذرا سوچئے، آپ کی اس
جھگڑالو سبیل بی بی کا کیا ہوگا۔“ اس کے الفاظ پر وہ دل کھول کر ہنسا تھا، پھر ذرا سی نگاہ پھیر کر ادھر
ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بات نہیں، وہ تم جیسی بیوقوف لڑکی کے ساتھ سمجھوتہ کر لے گی، اور ویسے بھی
اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے.....“

”تم مر جاؤ گے میرے ہاتھوں ایلان.....“ ہاتھ میں پکڑی کتاب اس کے سر پر
مارتے ہوئے وہ ہنسی تھی۔

”ہاں، تمہارے اس سبحان علی شاہد کے بے درد ہاتھوں سے مرنے سے کروڑ درجہ
بہتر ہے کہ میں تمہارے نرم و نازک سے ہاتھوں سے وفات پا جاؤں، اگر ایسا ہو جائے تو اور کیا
چاہیے.....“ وہ کسی طور سیریس ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، مگر اس لمبے انزلہ شاہ کا دل، جیسے
کسی نے اپنی مٹھی کی گرفت میں لے کر مسل ڈالا تھا، بے حد خفگی سے ایلان کی طرف دیکھتے
ہوئے، وہ اس دن، وہاں یونیورسٹی لان سے اٹھ گئی تھی، مگر آج اس کے کبے الفاظ کا درد اس
سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ آج شدت سے اس کا من چاہ رہا تھا کہ کہیں سے ایلان جعفری
نکل کر آئے اور وہ اس کے چوڑے شانے پر سر رکھ کر اتنا روئے کہ اس کے آنسوؤں میں
سبحان علی شاہد کے لئے مچلتی ساری نفرت بہہ جائے۔

”آئی مس یو ایلان۔“ دھیمے سے بڑبڑا کر اس نے کہا اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر
رو پڑی۔

☆☆☆

دل کی حالت یہ کسی طرح سنہلتی ہی نہیں
خواب در خواب ہے تعبیر نکلتی ہی نہیں

پھانسی دلوؤں گا، تم دیکھنا، میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ بس، ایک بار وہ میرے سامنے آ جائے۔ اس..... اس بے غیرت نے مجھے سبعین کی کچھ تصاویر بھی بھیجی ہیں، اور ان تصاویر کی وجہ سے ہی میرے ڈیڈی کی ڈیجھ ہوئی ہے شان، میں اس ذلیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“

غم و غصے سے ذیشان رحمانی کا حال برا ہو رہا تھا، جب اس کے پہلو میں کھڑے خوبرو سے شانزل علی شاہ نے، قطعی بے چارگی کے عالم میں، اپنے سے کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی زویا خان کی طرف دیکھا، جو خود نجانے کب سے نمٹکی باندھے اس کی سمت ہی دیکھ رہی تھی۔

”کم ڈاؤن مسٹر ذیشان..... اگر شانزل کو ان لوگوں کا یہ معلوم ہوتا، تو بھلا یہ انہیں آسانی سے چھوڑ دیتے؟ پھر جہاں تک میرا خیال ہے، اس وقت آپ کو جوش کی بجائے، ہوش سے کام لینا چاہیے۔ اس وقت بجائے اس کے کہ آپ اپنے دشمن کے بارے میں سوچ سوچ کر، کڑھیں، آپ کو اپنی بہن کی طرف توجہ دینی چاہیے، اس وقت آپ لوگ محض سبعین کے بارے میں سوچیں، کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے، زیادہ دن تک ان کا اس حال میں رہنا، خطرے سے خالی نہیں.....“

انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اس نے، ذیشان رحمانی کی بھڑکتی آگ پر، فکر کا پانی ڈالتے ہوئے، اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ جس پر جہاں شانزل علی شاہ نے مشکور نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا، وہیں سوچ میں ڈوبے ذیشان رحمانی نے بھی تھکی تھکی سی سانس، فضا کے سپرد کرتے ہوئے، دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

دن جیسے جیسے گزر رہے تھے، شانزل علی شاہ کے دل میں زویا خان کی اہمیت کا گراف مزید بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ محض اس کی پرسنل سیکریٹری نہیں رہی تھی، بلکہ انتہائی قریبی دوست بھی بن چکی تھی، اب وہ دل کی ہر بات بلا جھجک اس سے شیئر کر کے، ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا، اس روز بھی وہ قریبی پارک میں، ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ننھے منے بچوں کو، پھرتی سے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح، زویا خان نے، گفتگو کا آغاز کیا۔

”شانزل..... آپ سے ایک پرسنل سا سوال پوچھوں.....“

اس کی نگاہیں اب بچوں سے ہٹ کر، شانزل کے چہرے پر جمی تھیں، وہ چونک کر اس کی سمت دیکھے ہوئے بولا۔

”ہاں پوچھو ناں، اجازت کی کیا ضرورت ہے.....؟“

بھلے وہ خود کو سنبھال چکا تھا، مگر اب بھی زویا خان کو اس کی مقناطیسی نگاہوں میں، گزرے ہوئے ہر لمحے کی دھول صاف اڑتی دکھائی دے رہی تھی، تبھی وہ پھر سے اپنی نگاہ، بھاگتے دوڑتے بچوں پر مرکوز کرتے ہوئے بولی۔

”آپ نے اپنی آئندہ زندگی کے لئے کیا سوچا ہے شانزل، ساری عمر تو کسی کی یادوں کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی، فرض کریں کہ اگر اسے کبھی ہوش نہ آیا، تو کیا کریں گے آپ؟ کیا یونہی ساری عمر، دل کا درد، دل میں چھپائے پھرتے رہیں گے.....؟“

وہ ابھی شاید مزید کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر شانزل نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”میں اس کی یادوں کے سہارے، زندگی کو نہیں گھسیٹ رہا زویا، اور نہ ہی میرے دل میں اس کی محبت کا کوئی دیپ روشن ہے، میں نے تمہیں بتایا ناں کہ میں نے کبھی اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا ہی نہیں.....“

”تو پھر آپ کی آنکھوں میں، اسے کھودینے کا درد کیوں بچل رہا ہے، کیوں اس کے لئے اتنے ڈسٹرب رہتے ہیں آپ؟“

”آئی ڈونٹ نو، شاید یہ میرا احساس جرم ہے، جو کسی پل مجھے چین لینے نہیں دے رہا، مگر تم دیکھنا زویا، جس دن وہ آنکھیں کھول کر، نارٹی جینا شروع ہوگئی، اس دن میں اس درد کے حصار سے باہر نکل آؤں گا جو تمہیں ہر وقت میری نگاہوں میں مچلتا دکھائی دیتا ہے.....“

گہری سانس بھرتے ہوئے، اس نے جیسے زویا خان سے زیادہ، خود کو یقین دلایا، پھر تھکی تھکی سی ایک نظر اس کے دلکش سراپے پر ڈال کر، دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو زویا.....“

”تھینکس، ویسے آپ کو تو، میں روز اچھی لگتی ہوں.....“ وہ قدرے اترا کر بولی تھی، جب وہ ہلکے سے ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ تو ہے، خیر پہلے میں تمہیں، تمہارے گھر چھوڑ دوں، پھر ہاسپٹل کا چکر لگاؤں گا.....“ اپنی قیمتی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے، اس نے لب بھینچے تھے، جب وہ فرنٹ سیٹ پر اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”ہاسپٹل کے چکر لگاتے لگاتے، کہیں بھٹک نہ جائیے گا.....“

”کوئی پرواہ نہیں، اگر ایسا ہو بھی گیا، تو تم ہوناں، مجھے سنبھالنے والی، تم کہاں بھٹکنے

واپس آتے ہیں، میں تمہیں ان کے ساتھ، واپس شہر بھجوا دیتی ہوں.....“

اس کی اداس آنکھوں میں عجیب سا غم دیکھ کر، دادی ماں کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا، مگر انزلہ نے بھلا ان کے الفاظ پر دھیان ہی کہاں دیا تھا، اس کا ذہن تو اس وقت بھی، صرف اور صرف سمعان علی شاہد کے متعلق، مختلف سوچوں، میں ڈوبا تھا۔ تبھی اس روز وہ دادی ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود، پھر سے سمعان علی شاہد سے ملنے کو نکل کھڑی ہوئی۔ مگر اس سے قبل کہ وہ اس کے ڈیرے تک پہنچتی، راستے میں ہی اس کا ٹکراؤ ایلان جعفری کی پاگل ماں کے ساتھ ہو گیا، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، چہرے کو چادر میں چھپائے، خوب روئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے بہت قابل رحم لگیں۔ تبھی وہ ان کے راستے میں کھڑی ہو کر دور سے ہی انہیں قریب آتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

”سنو..... تب..... تم نے میرے ایلان کو دیکھا ہے، ابھی، ابھی گھر سے نکلا ہے وہ، دیکھا ہے تم نے اسے.....؟“

موتیوں سی شفاف روئی ہوئی آنکھوں میں، جوان بیٹے کی دائی جدائی کا دکھ، ہلکورے لے رہا تھا۔ اس قدر درد تھا، ان کی دکھی آنکھوں میں کہ انزلہ زیادہ دیر تک نگاہ باندھ کر ان بوڑھی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکی۔

”مم..... میں نے اس کی پسند کا سالن بنایا ہے، مگر..... نجانے کہاں چلا گیا ہے وہ، پتہ نہیں مجھ سے روٹھ کر گیا ہے، یا یونہی ستا رہا ہے مجھے.....“

بنا آنسو لٹائے بھی، ان کا چہرہ کرب کی مکمل تصویر بنا ہوا تھا۔ یونہی بڑبڑاتے ہوئے وہ انزلہ کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھیں، مگر اس کے ساکت وجود میں جیسے پھر حرکت ہی نہیں ہوئی، دھواں دھواں سی آنکھیں لئے، وہ نجانے کب تک وہاں کھڑی، انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

”خدا کرے تم مر جاؤ سنی استاد.....“

دل کی گہرائیوں سے ایک دعا کک بن کر ہونٹوں کی دہلیز تک آئی تھی اور اس نے سرعت سے پلکوں پہ آئے لرزے آنسو صاف کر کے، آگے طویل کچی پگڈنڈی کو دیکھا تھا۔

ارد گرد لہلہاتے سرسبز کھیت نگاہوں کو عجیب سی تراوٹ بخش رہے تھے، تبھی اچانک اس کی نگاہ، کچھ ہی فاصلے پر، گھاس کاٹنے، ایک خوب روئے نوجوان پر پڑی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے نگاہ اٹھا کر بھی انزلہ کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

دوگی مجھے.....“ قطعی بے نیازی سے کہہ کر، اس نے اپنی توجہ سامنے روڈ کی جانب مرکوز کر لی تھی، جب کہ اس کے پہلو میں بیٹھی زویا خان کا دل، کتنی ہی دیر تک اپنی اصلی حالت میں واپس نہ آ سکا تھا۔

چھٹی کا دن تھا اور دوپہر قدرے ڈھل رہی تھی، سوزویا خان کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد، وہ سیدھا ہاسپٹل چلا آیا۔ دل ایک مرتبہ پھر، سبعین الہدیٰ کی جامد خاموشی پر درد میں ڈوب کر ابھرا تھا، مگر جو نبی اس نے اس کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا، ٹھٹھک کر رہ گیا۔ نظر سے کچھ ہی فاصلے پر سفید بستر پر لیٹی سبعین الہدیٰ کی پلکیں، دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

☆☆☆

عج تھے کھو کے سوچتا ہوں، میرے دامن طلب میں کوئی خواب ہے تو کیوں ہے، کوئی پیاس ہے تو کیوں ہے

میں اجڑ کے بھی ہوں تیرا، تو پچھڑ کے بھی ہے، میرا

یہ یقین ہے تو کیوں ہے، یہ قیاس ہے تو کیوں ہے

”انزلہ بیٹی..... تجھے کچھ خبر ہے کہ سنی استاد نے کیا کیا ہے.....؟“

کچھ گھر کے وسیع صحن میں بیٹھی وہ دادی کے ساتھ، پالک بنوا رہی تھی، جب ساگ کاٹتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ جواب میں فوراً نگاہیں اٹھا کر خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی، جیسے پوچھ رہی ہو کیا ہوا دادی ماں.....؟

”تو تو بڑا پڑھا لکھا کہہ رہی تھی اسے، مگر وہ تو جہالت میں جانوروں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گیا ہے، بیٹی، کل محض پانی کے مسئلے پر، اس نے اسی گاؤں میں رہنے والے افضل حسین کے جوان سالہ بیٹے کو، طیش میں آ کر، انتہائی بے دردی سے مارا ہے، وہ تو بچے کی زندگی باقی تھی، لہذا اسے ہوش آ گیا، ورنہ اپنی طرف سے تو، اس نے پوری تسلی کر کے ہی پھینکا ہوگا اسے، اب بھی بے چارہ دونوں ناگوں سے محروم ہو گیا ہے.....“ دادی ماں کا لہجہ قدرے اداس تھا، جب کہ اس کا دل جیسے ایک مرتبہ پھر خون میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

”وہ راہ حق کا بھٹکا ہوا راہی ہے دادی ماں، مگر میں اسے زیادہ عرصے تک ایسا نہیں رہنے دوں گی.....“

”نہیں، تم اب دوبارہ کبھی اس کے منہ نہیں لگو گی، جیسے ہی تمہارے دادا جی شہر سے

نے اس اجنبی نوجوان کو دیکھا تھا، جو اس کے پیچھے، کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑا، خاصے انہماک سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”فرمائیے،“ شعلوں سالجہ، یک لخت نرم، ہوا تھا۔ تبھی وہ حوصلہ پاتے ہوئے بولا۔
 ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ انزلہ شاہ ہی ہیں نا.....؟“ مقابل کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تھی، تبھی اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، دھیرے سے کہا۔
 ”ہاں، مجھے انزلہ شاہ کہتے ہیں، مگر..... آپ مجھے کیسے جانتے ہیں.....؟“
 ”ایمان، آپ کا بہت تذکرہ کرتا تھا۔ بس اسی کی معرفت، آپ کی شخصیت سے جان پہچان ہوئی تھی.....“

”ارے..... مگر..... آپ ایمان کو کیسے جانتے ہیں.....“
 پہلی مرتبہ گاؤں میں کسی کے منہ سے ایمان کا تذکرہ سن کر وہ بے حد خوش ہوئی تھی، جب وہ دور نیلے آسمان پر اڑتے، خوبصورت پرندوں پر نگاہ نکالتے ہوئے بولا۔
 ”دوست تھا وہ میرا، بے حد قریبی دوست، اکثر ہم لوگ یہاں کھیتوں میں بیٹھ کر، اپنے دل کی باتیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے، جب بھی وہ شہر سے آتا تھا، بس آپ کا ہی ذکر کرتا رہتا تھا، مگر.....“
 ”مگر کیا..... پلیز بتائیے نا.....“ اس کے ادھورے لہجے میں وہ چل کر رہ گئی تھی۔
 جب وہ اداس سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔

”مگر..... مگر وہ مر گیا انزلہ شاہ صاحبہ اور آپ کے ذکر نے جان لے لی اس کی.....“
 وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو چکا تھا، مگر اس بار انزلہ شاہ کے سر پر ساتوں آسمان ایک ساتھ گرے تھے، پھٹی پھٹی نگاہوں میں حد درجہ بے یقینی تھی، مگر اس کے سامنے کھڑے اس خوبرو سے شخص نے، اس کی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھا۔

”بہت پیار کرتا تھا وہ آپ سے، مگر آپ کی آنکھوں میں کسی اور کے لئے پیار دیکھ کر، اس نے اپنی تمنائوں کا گلہ گھونٹ دیا، اس نے کبھی آپ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ آپ کو بے حد چاہتا ہے، مگر..... اس کے دل کا یہ راز، نجانے یہ سنی دادا، کیسے جان گیا حالانکہ اس نے تو کبھی ہم یاروں سے بھی، یہ بات شیئر نہیں کی، کبھی یونیورسٹی میں بھی بے احتیاطی سے کام نہیں لیا، مگر پھر بھی آپ کے سمعان علی شاہد نے، اس کی روشن نگاہوں سے آپ کی محبت کا بھید پالیا۔ اسی محبت کے بھید نے، سمعان علی شاہد کے ہاتھوں، ہر قدم پر اسے تکلیف پہنچائی اور بالآخر..... وہ

شام اب دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ وہ گھر سے سنی استاد سے ملنے کا ارادہ کر کے نکلی تھی، مگر اس وقت اس کا دل اس قدر مکدر ہو رہا تھا کہ وہ اسے اپنے تصور میں لانا بھی پسند نہیں کر رہی تھی، ماحول میں دور کہیں چلنے والی پن چکی کی آواز، سماعتوں کو بے حد بھلی لگ رہی تھی کہ اسی اثناء میں سنی استاد کا منشی ماجا نجانے، کہاں سے نکل کر، اس کے راستے میں آکھڑا ہوا۔
 ”اکیلی اکیلی کہاں جا رہی ہو حسینہ..... آؤ میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں.....“
 خباثت چھلکاتی نگاہیں اس کے صبیح چہرے پر مرکوز کئے، وہ قدرے مسکرا کر بولا تھا، جب انزلہ نے قہر آلودی ایک نگاہ اس کے مسکراتے چہرے پر ڈال کر، پل دوپل کے لئے رکے قدم آگے بڑھا دیئے۔

”ارے، ایسے کہاں جا رہی ہو بلبل، کم از کم آفر کا جواب تو دیتی جاؤ.....“
 کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے لپک کر انزلہ کا بازو تھاما تھا، اور وہ شدید مشتعل ہو کر اس کی طرف پلٹی اور جما کے زبردست تمانچے، اس کے بائیں گال پر جڑ دیا۔
 ”میں تم جیسے لوفروں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی، سمجھتے تم.....“
 قطعی خفگی کے انداز میں شہادت کی انگلی اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی، خوبصورت سی انزلہ شاہ کو، کچھ ہی فاصلے پر کھیت میں بیٹھے، اس نوجوان نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔
 ”تم جیسے بدمعاشوں نے کیا سمجھ لیا ہے کہ گاؤں تمہارے باپ کی جاگیر ہے، تم لوگ جیسا چاہو گے، یہاں کرتے پھرو گے، نیور یوسٹوڈ مین، نہیں ہونے دوں گی میں ایسا، سنا تم نے، جا کر کہہ دو اپنے اس سنی استاد کو، نہیں ڈرتی میں اس سے، جس طرح اس نے ایمان کو موت کی نیند سلایا ہے، میں بھی ایسے ہی موت کے انجام تک پہنچاؤں گی جاؤ..... کہہ دو جا کر اسے.....“
 اس وقت وہ اتنی شدت سے چلا رہی تھی کہ اسے خود اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں تھا۔
 خوبصورت گلابی ہونٹ تھر تھرا رہے تھے، نیلگوں سی آنکھوں میں عجب سی وحشت ناچ رہی تھی، اور اس کے سامنے کھڑا، وہ سنی استاد کا چچہ، قدرے حیران ہوا تھا، گاؤں کی تاریخ میں پہلی بار کسی لڑکی نے یوں کھلم کھلا، سنی استاد کے ساتھ نفرت کا اعلان، کیا تھا، وگرنہ لڑکیاں تو اس کے سامنے سے بھی سہم کر خوف زدہ ہو جایا کرتی تھیں۔

”بات سنیں پلیز.....“

ماجاشی وہاں سے جا چکا تھا۔ تبھی اس نے پھر سے اپنے قدم آگے بڑھائے تھے کہ اس اجنبی پکارنے پھر سے اس کے آگے کو اٹھتے قدم روک دیئے۔ بے ساختہ پلٹ کر انزلہ شاہ

اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔

”اجنبی نوجوان کا گلا قدرے رندھ گیا تھا، جب انزلہ شاہ نے اپنے تیزی سے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”آپ یہاں سے چلی جائیں انزلہ شاہ..... مت ایلان کی ڈگر پر چلیں آپ..... زندگی بہت نایاب چیز ہے۔ اسے جذبات کے بہکاوے میں آکر، گوانا نہیں چاہیے.....“

پتہ نہیں وہ اسے نصیحت کر رہا تھا، یا محض ڈر رہا تھا، مگر اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا، کہ وہ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا نہیں پائی تھی۔

”ویسے اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا، زندہ رہتا تو میری طرح زندہ لاش بن کر جینا پڑتا اسے.....“

پھر سے اس کا لہجہ بھگ رہا تھا، تبھی انزلہ شاہ نے بے حد چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ک..... کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ پپ..... پلیز بتائیں ناں، کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ.....؟“

پُر غم شام کے اداس دھندلوں کی مانند، اس کا لہجہ میری طرح کپکپا رہا تھا، وہ صاف دیکھ سکتی تھی کہ اس کے سوال پر سامنے کھڑے اس خوب رو سے مرد کی آنکھوں میں عجیب سے کرب نے سراٹھایا ہے، مگر اس کے باوجود لبوں پر دھیمی سی ہنسی ہوئی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولا۔

”پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے، خیر شام ڈھل رہی ہے، آئیے میں آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں.....“ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے درد کی تشہیر سے پہلو بچا رہا ہے، تبھی انزلہ نے بھی اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا، تاہم اُس کی آنکھوں میں۔ اب بھی عجیب سا اضطراب قفس کر رہا تھا، اب بھی اس کی ٹانگیں دھیرے دھیرے کپکپا رہی تھیں، حواس اب بھی سن تھے، مگر پھر بھی اس نے، اس اجنبی نوجوان کی تقلید میں اپنے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

”سوری، میں نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں، مجھے ساجد حسین کہتے ہیں، میرے بابا، رشید حسین، آپ کے دادا جی کے بہت قریبی دوست ہیں، شہر میں انٹر تک پڑھا ہے میں نے، پھر بابا کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم کو خیر آباد کہہ کر یہاں گاؤں میں کھیتی باڑی شروع کر دی، بہت پیار کرتے ہیں بابا مجھ سے، اکلوتا بیٹا ہوں ناں ان کا، شادی کے پورے اکیس سال بعد پیدا ہوا تھا، تبھی بہت خیال رکھتے ہیں میرا.....“

بہت دھیرے لہجے میں وہ اسے اپنے متعلق آگاہی دے رہا تھا کہ اچانک سنی استاد

کی جیب نے، عین ان کے قدموں کے قریب پہنچ کر، بریک لگا دی، سرخ سرخ، غلافی نگاہوں میں بے انتہا غصہ تھا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ اس کے مزاج ٹھکانے لگتی، اس کے آدمیوں نے جیب سے کوڈر ساجد حسین کو پینٹا شروع کر دیا، جب کہ وہ، اس کا بازو جکڑ کر اسے اپنے پہلو میں فرنٹ سیٹ پر دھکیلتے ہوئے تیزی سے جیب آگے بڑھا لے گیا۔

☆☆☆

میں بے منزل کا راہی ہوں، میرے پاؤں سفر کے عادی ہیں

ہمد ہے کوئی نہ ہمراہی

منزل کا نشان، نہ رخت سفر

میں ہر انجانے رستے پر، کچھ دیر چلوں اور کھوجاؤں

بستی میں رہوں لرزاں، لرزاں

صحرا میں پھروں حیراں، حیراں

میں جلتی ریت پہ چلتا ہوں پتھر بھی ہیں راہ میں کانٹے بھی

یا ظالم دھوپ کی گرمی ہے یا رات ہے گہری ظلمت کی

دل غم سے بوجھل بوجھل ہے اور پاؤں میں کتنے چھالے ہیں

نا کام بھی ہوں ناشاد بھی ہوں

مایوسی بھی اُمید بھی ہے

اک پیار کا چشمہ پھوٹے گا، اک گلشن ہم بھی پائیں گے

اس کھوج میں صحرا چھانے ہیں، اس آس پر جیتا رہتا ہوں۔

سبعین الہدی کے وارڈ میں، ڈاکٹر اور اس کے رشتہ داروں کا ایک ہجوم جمع تھا، خود ذیشان رحمانی کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ جو پچھلے تین ماہ سے خاموش پڑی تھی، آج بلاشبہ خدا کی کرم نوازی کے باعث ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آئی تھی۔

مگر اس وقت نیند کے انجکشن کے باعث پھر سے مدہوش تھی، سوادھم مچاتے دل کی دھڑکنوں کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے، وہ غم آنکھوں سے ذیشان رحمانی کی پشت تھپتھا کر اسے مبارک باد دیتے ہوئے، انتہائی سرشاری کے عالم میں، ہسپتال سے سیدھا، مسجد کی طرف چلا آیا۔

خدا کے پُر سکون گھر میں، وضو کے بعد وہ اس کے حضور حاضر ہوا تو کب سے رکے

پیشانی کے آنسو گالوں پر بہہ نکلے۔ رہ رہ کر اسے اپنی کوتاہیاں اور گناہ یاد آ رہے تھے، اسے یوں

لگ رہا تھا کہ جیسے مسجد کی ایک ایک اینٹ اس کی بد نصیبی پر آنسو بہا رہی ہو، کتنے عرصے کے بعد وہ آج اس معبود حقیقی کو یاد کر رہا تھا کہ جس نے کسی بھی پل اسے فراموش نہیں کیا تھا۔ بناء مانگے اسے ہر خوشی، ہر راحت عطا کی تھی، ہمیشہ اس کے عیوب اور کوتاہیوں کو چھپا کر اسے وقار عطا کیا تھا کتنا رحیم تھا وہ، کہ بناء شکر گزاری کے بھی اسے نوازتا رہا تھا، مگر کس قدر گنہگار تھا وہ، کہ کبھی اس کی ذات کے حضور جھک کر محض اس کا شکر تک ادا نہیں کر پایا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد، اس کا من جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا۔

اس نے اللہ کے حضور شکرانے کے لئے ہاتھ اٹھائے، سبعین الہدیٰ کی زندگی بچ جانے پر وہ اتنا مسرور دکھائی دے رہا تھا کہ اسے خود اپنی اس خوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اسی شام اس نے زویا خان کو اس کی پسند کے عین مطابق، شہر کے ہنگے ترین ہوٹل میں ڈنر کروایا تھا، زویا خان نے آج سے قبل اسے اتنا مسرور کبھی نہیں دیکھا تھا، مگر نجانے کیوں شانزل علی شاہ کے لبوں پر وجہ بے وجہ کھلنے والے یہ مسکراہٹوں کے حسین پھول، اس کے من مندر میں ادا سی بکھیر رہے تھے۔ مگر اس نے یہ ادا سی شانزل علی شاہ پر کھلنے نہیں دی تھی، وہ جتنی بھی دیر اس کے ساتھ رہی تھی، اس کی مسکراہٹوں کے پھول چلتی رہی تھی۔

اس رات اگر نیند شانزل علی شاہ کی آنکھوں سے روٹھی تھی، تو زویا خان کی آنکھیں بھی سلگتی رہی تھیں، ایک عجیب سی بے قراری نے رات بھر اسے اپنی لپیٹ میں لئے رکھا تھا، مگر اگلے روز شانزل علی شاہ سے ملی تو خود کو اچھا خاصا کمپوز کر چکی تھی۔

شانزل اب بھی بہت مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ پھر سے سبعین الہدیٰ کو دیکھنے کا تصور ہی اسے عجیب سے احساس سے دوچار کر رہا تھا، سو جلدی جلدی سارے کام پٹنا کر، وہ زویا خان کے ساتھ، لٹچ سے قبل ہی ہسپتال کی طرف چلا آیا۔ اسے زندہ جاوید، ہنستے بولتے دیکھنے کا تصور ہی اس کے من میں سرشاری بھر رہا تھا، مگر اسے ایک مرتبہ پھر منہ کے بل گرنا پڑا۔ وہ تو اس سے ایکسکیوز کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہ رہا تھا، مگر وہاں تو کوئی اور ہی منظر تھا۔ سفید بستر پر بیٹھی، وہ خود اپنے ہی بال نوچتے ہوئے بری طرح چلا رہی تھی۔

”چھوڑ دو مجھے، خدا کے لئے مجھے میرے گھر جانے دو، مت قریب آنا میرے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے.....“

ڈاکٹر، دونسیں اور خود ذیشان رحمانی اسے سنبھال رہے تھے۔ مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آرہی تھیں۔ بیڈ کے قریب پڑے ٹیبل سے ساری چیزیں اٹھا اٹھا کر اس نے دور پھینک دی

تھیں۔ ہر کوئی اس کی حالت پر ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

”جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے، چھوڑ دو مجھے، پلیز.....“

زارو قطار روتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر، وہ بہت عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی، جب ایک ڈاکٹر نے سرعت سے آگے بڑھ کر، اسے نیند کا انجکشن دے دیا۔

”سوری مسٹر ذیشان، ان کے ذہن پر کسی بھی ایک سانچے کا بہت گہرا اثر ہے، فی الحال یہ اپنے ہواس میں نہیں ہیں، ہمیں ڈر ہے کہ اگر ان کی یہ کنڈیشن برقرار رہی تو یہ پاگل ہو سکتی ہیں.....“

سبعین کو نیند کا انجکشن دینے کے بعد، ڈاکٹر نے ذیشان رحمانی کو اطلاع دی تھی، مگر ڈاکٹر کی اس اطلاع پر زمین شانزل علی شاہ کے قدموں تلے سے کھسکی تھی۔ بڑے بے ساختہ انداز میں اس نے لڑکھڑا کر قریبی دیوار کو تھاما تھا، ہزار ضبط کی کوشش میں بھی وہ اپنی پلکوں کو بھیگنے سے روک نہیں پایا تھا، دل میں ایک دم سے ہی درد، وہ بے قراری کے طوفان نے سر اٹھایا تھا، تب زویا خان کی طرف دیکھے بغیر، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، ہسپتال سے باہر آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر، خود کو انجان راستوں کے سپرد کر دیا۔

”کتنی اذیت سہہ رہی ہے وہ میری وجہ سے، کیوں اس قدر حیوانیت پر اتر آیا تھا میں.....؟ اومائی گاڈ، کیا کروں میں، کیسے نارمل زندگی کی طرف واپس لاؤں اسے.....“

اسٹیرنگ پر مکے برساتے ہوئے وہ حد سے زیادہ ڈسٹرب دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پورا ایک ہفتہ اسی اضطراب میں بسر ہوا تھا۔ اس دوران زویا خان نے ہر ممکن طریقے سے، اس کی دلجوئی کی کوشش کی تھی، مگر سبعین الہدیٰ کی حالت دیکھ دیکھ کر، وہ جیسے خود پاگل ہونے کے قریب ہو گیا تھا۔ چند ہی روز میں کافی کمزوری در آئی تھی، شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور آج کل تو وہ اپنے حلیے پر بھی توجہ نہیں دے رہا تھا، ایک سوٹ میں تین تین دن گزار دیتا تھا۔ زویا خان کے لئے اس کی یہ حالت بہت تکلیف دہ تھی، مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اس کے لئے، چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

اگلے پندرہ بیس دنوں میں وہ باقاعدگی سے پانچوں ٹائم کی نماز ادا کرنے لگا تھا اور شاید یہ اس کی التجاؤں کا ہی اثر تھا کہ اب سبعین الہدیٰ کی حالت پہلے سے کافی سنبھل گئی تھی، گواہ بھی اس کے حواس مکمل طور پر بیدار نہیں ہوئے تھے مگر اب وہ پاگلوں کی طرح قابو سے باہر ہو کر، ادھر ادھر چیزیں اٹھا کر نہیں پھینکتی تھی، پھر اس نے ذیشان رحمانی کو بھی پہچان لیا،

شانزل نے خود اسے ذیشان سے لپٹ کر بری طرح روتے ہوئے دیکھا تھا۔

جب سے وہ ہوش میں آئی تھی، وہ اس کے سامنے نہیں گیا تھا، کبھی اتفاق سے وہ اکیلی سوزی ہوئی، تو چند لمحے، اس کے پاس بیٹھ کر، دل ہی دل میں اسے نیک تمناؤں سے نوازنے کے بعد، وہ چپ چاپ واپس چلا آتا تھا پچھلے کئی روز سے اس کا یہی معمول تھا، ذیشان رحمانی کے درپردہ، وہ اب بھی سبعین کے علاج کے لئے، بہت سے اخراجات، چپ چاپ انورڈ کر رہا تھا، ہر روز اس کے لئے تازہ پھولوں کے بوٹے لاتا تھا اور اس کے سرہانے رکھ کر چپ چاپ واپس لوٹ آتا تھا، ذیشان اب اس کا بے حد شکر گزار ہو رہا تھا، اندر کی کہانی سے قطعی بے خبر، وہ اس سے اپنی ہر پرالیم بلا جبکہ شیر کر لیتا تھا۔ دونوں سبعین کے حوالے سے گھنٹوں محو گفتگو رہتے تھے، ڈاکٹرز اب مطمئن تھے کہ سب زندگی کی طرف بلا آخر واپس لوٹ رہی تھی، گزرتے ہر دن کے ساتھ، اس کے ساتھ بیتے واقعے کا اثر اس کے ذہن سے کم ہو رہا تھا، اگلے چند ہی روز میں وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے والی تھی۔ ذیشان اور شانزل دونوں ہی اس کا بے حد خیال رکھ رہے تھے، مگر اس روز تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ شانزل، ذیشان کے ساتھ، سبعین کے کمرے سے باہر کھڑا، ڈاکٹرز سے چند ضروری امور پر ڈسکس کر رہا تھا، جب اچانک سبعین کی آنکھ کھل گئی اور اس نے شیشے کے باہر کھڑے شانزل علی شاہ کو دیکھ لیا۔

☆☆☆

نغمسار اب کے روبرو بھی نہیں
پھر ہمیں اس کی جستجو بھی نہیں
یوں مسائل سے زندگی، الجھی
دل میں اب کوئی، آرزو بھی نہیں

انتہائی فاسٹ ڈرائیونگ کے بعد، سعان علی شاہ نے، اپنے ڈیرے کے قریب جیپ روکی، تو پچھلی کی مانند تڑپتی انزلہ شاہ کا حال دیکھنے لاق تھا، غم و غصے سے اس کی آنکھیں جیسے سگ رہی تھیں۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سعان علی شاہ کو منٹوں میں ختم کر دیتی، کس قدر طیش کے عالم میں، اس کی جیپ سے اترتے ہی، انزلہ نے اس کے گال پر اپنے ہاتھ کا نشان چھوڑنا چاہا تھا، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ سعان علی شاہ، اس سے قبل ہی اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

”حالات نے اس چہرے پر بہت طمانچہ لگائے ہیں انزلہ شاہ، تم یہ زحمت نہ

کرو.....“ بہت عجیب سا لہجہ تھا اس کا، مگر انزلہ شاہ نے دھیان نہیں دیا تھا، کیونکہ اس وقت اس کا دل پھٹنے کو تھا۔

”ہاں، تم جیسے جانور کو سبق سکھانے کے لئے بھلا ایک تھپڑ سے کیا ہو گا، تمہیں تو سرعام پھانسی ملنی چاہیے، تاکہ دوسرے لوگ بھی تمہاری طرف دیکھ کر کچھ عبرت پکڑیں.....“

”ہا..... ہا..... ہا، اچھا.....؟ مگر کون دے گا مجھے پھانسی.....؟“ دوسری طرف سعان نے جیسے اس کے الفاظ کو بے حد انجوائے کیا تھا، تھی وہ کسی ناگن کی مانند، غصے سے بل کھاتے ہوئے پھنکار کر بولی۔

”میں دلوؤں کی تمہیں پھانسی..... دیکھ لینا تم.....“ انزلہ شاہ کے تنفر سے کہنے پر، سعان کچھ پل بہت دلچسپ لگا ہوں سے اس کی سمت دیکھا تھا، پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے خوبصورت چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”اتنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے جان؟ صرف ایک پیار بھری نگاہ مجھ پر ڈالو، خود ہی مر جاؤں گا میں.....“

”بکواس بند کرو، اور ابھی مجھے میرے گھر واپس چھوڑ کر آؤ.....“ انزلہ شاہ نے دھاڑ کر کہا تو وہ بھی خمار کی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا، ابھی اس کی طرف سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

”اوکے، لیکن آئندہ میں تمہیں، یہاں گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بات کرتے نہ دیکھوں.....“

”کیوں..... میں تمہاری کنیز ہوں، یا کوئی زر خرید لونڈی، جو تمہارے حکم کی تابعداری کروں.....“ وہ غصے سے کھول کر رہ گئی تھی، جب وہ قطعی سنجیدہ لہجے میں بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم میری محبت ہو انزلہ، اور میں بالکل برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی تمہیں نگاہ بھر کر دیکھے، تم سے بات کرے یا، کسی بھی طرح سے تمہاری توجہ حاصل کرے.....“

”شٹ اپ، سو بار لعنت بھیجتی ہوں میں تم پر اور تمہاری محبت پر، نفرت ہے مجھے تمہارے تصور سے، میرے اختیار میں ہو تو ایک منٹ سے پہلے تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں.....“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے غصے و نفرت کا اظہار کس انداز میں کرے کہ اس کا دل کٹ کر رہ جائے۔ تبھی پھنکار کر تیز لہجے میں بولی تو ایک پچیسکی سی مسکراہٹ سعان علی

شاہد کے لبوں کو چھو گئی۔

”اوکے، جب ساری دنیا میری ذات سے نفرت کرتی ہے تو ایک تم بھی سہی انزلہ شاہ، کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے تمہاری نفرت سے، مگر یاد رکھو، میرے علاوہ اگر کوئی تمہیں سوچنے کی جسارت بھی کرے گا، تو میں اس کی کھال اُتار دوں گا، سمجھی تم.....“

”ہاں، بخوبی سمجھ گئی ہوں میں، تم جیسا غنڈہ اور کر بھی کیا سکتا ہے.....“

اپنے تئیں اس نے، سمعان علی شاہ کو منہ توڑ جواب دینے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے پھر سے انزلہ شاہ کے الفاظ کو انجوائے کیا تھا۔

”گلد، بخوبی سمجھ گئی ہو تو دوبارہ یہ غلطی مت دہرائنا، ورنہ کچھ عجیب نہیں کہ میرے ہاتھ پھر سے کسی کے خون، میں رنگ جائیں.....“ اپنی بات کہنے کے بعد وہاں ٹھہرا نہیں تھا، جب کہ ساکت کھڑی انزلہ شاہ وہیں کھڑی کتنی ہی دیر تک اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی تھی۔

اس روز سمعان علی شاہ کے آدمیوں نے ساجد حسین کو نہایت بے دردی کے ساتھ پینا تھا۔ ایلان جعفری کا دوست ہونے کی حیثیت سے وہ تو پہلے ہی اس کی ناپسندیدہ شخصیت میں شامل ہوتا تھا، کجا کہ اس نے خود، اپنی آنکھوں سے اسے، انزلہ شاہ کے ساتھ، باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا، انزلہ شاہ کے لئے سمعان علی شاہ کا جنون، ساجد حسین سے قطعی پوشیدہ نہیں تھا، مگر اسے یہ علم بھی کہاں تھا کہ وہ یوں ایک دم سے سامنے آ کر اسے انزلہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ لے گا۔

اس رات اگر بدن پر لگنے والے گہرے زخموں نے ساجد حسین کی آنکھوں سے نیند چھینی تھی، تو انزلہ شاہ کی اداس نگاہیں بھی، رات بھر شدید اضطراب کے عالم میں جاگتی رہی تھیں، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سمعان علی شاہ جیسے معے کو کیسے حل کرے؟ اس کے عتاب کا شکار گاؤں والوں کو کیسے ریلیف پہنچائے؟ جب کہ اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک تھی، خود انزلہ نے کتنے ہی اعلیٰ افسران کو، سمعان علی شاہ کے ڈیرے پر حاضری دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ کوئی بھی تو ایسا در دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ جہاں جا کر وہ انصاف کی اپیل کرتی اور اسے انصاف مل جاتا۔ سوائے خدا کی پاک ذات کی بارگاہ کے، مگر خدا بھی شاید اس کی رسی ابھی مزید ڈھیلی چھوڑ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر، اس کا دماغ جیسے پھٹنے کو تیار ہو گیا تھا۔ نفرت کے تیز الاؤ میں، محبت کا جھوٹا سا ٹھنڈا دیا، نجانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ اگلے روز وہ صبح نماز کے لئے بیدار ہوئی، تو دادی ماں، اسی کے بستر پر بیٹھی، نہایت تفکر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید

انہیں یقیناً، انہیں کل والے واقعے کی خبر ہو چکی تھی، لہذا انزلہ نے ان سے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں سارا واقعہ مختصر طور پر کہہ سنایا۔

”تو شہر واپس چلی جا انزلہ، خدا کا واسطہ ہے تجھے.....“ اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے نہایت بے بسی کے عالم میں روتے ہوئے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ جب وہ عقیدت سے ان کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”میرے شہر واپس جانے سے کیا ہو جائے گا دادی ماں.....؟ کیا میرے یوں شہر واپس چلے جانے سے سارا مسئلہ حل ہو جائے گا، کیا اس طرح سے وہ سدھر جائے گا، نیور دادی ماں، وہ ایسے کبھی نہیں سدھرے گا، یونہی غنڈہ راج چلتا رہے گا، اس گاؤں میں، یونہی لوگ سالوں تک سہمے رہیں گے اس سے، دادی ماں اس کی طرف دیکھ کر، آس پاس کے جاگیردار بھی، انسانیت سے دور ہو جائیں گے، ظلم بڑھتا چلا جائے گا لوگ یونہی اپنی زندگی کی بنیادی خوشیوں سے محروم رہیں گے، پھر..... پھر کیا فائدہ ہمارے آزاد ملک کا دادی ماں، اگر ہم اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکیں تو کیا فائدہ ایسی نام نہاد آزادی کا.....، پھر، یہی تو المیہ ہے ہمارے ملک کا، یہاں کوئی کسی سمعان علی شاہ کے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا، کوئی برائی کے سدباب کے لئے کوشش نہیں کرتا، اس پیارے آزاد وطن کے بے درد بزدل لوگ، سڑک پر کسی کو ترپتا دیکھ کر سنگدلی سے نظر انداز کرتے ہوئے، آنکھیں تو چرا سکتے ہیں دادی ماں، مگر یہاں کوئی کسی کی آہ پر لبیک کہہ کر، اس کی مدد نہیں کرتا، نفسا نفسی اور بے حسی کا یہ دیمک، میرے وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے دادی ماں، اور آپ کہتی ہیں میں کچھ نہ کروں.....؟ آرام سے اپنے لئے سوچ کر، یہاں کے لوگوں کو یونہی بھیا تک اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ دوں، نہیں دادی ماں، میرا ضمیر کبھی، مجھے اس کی اجازت نہیں دے گا، مجھے اس گاؤں سے غنڈہ راج کے خاتمے کے لئے، اگر اپنی جان بھی داؤ پر لگانا پڑی، تو میں کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گی دادی ماں، کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گی میں.....“ اپنی ہی رو میں بولتے ہوئے اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ کب اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھک آئے۔ دادی ماں نے فقط ایک خاموش نگاہ، اس پر ڈالی، پھر خاموشی سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ آج سے بہت سال پہلے ان کا اکلوتا بیٹا، بھی تو ایسے ہی جذبات رکھتا تھا، یونہی اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر، دوسروں کے دکھ درد میں کود پڑتا تھا۔ انزلہ بھی اپنے باپ پر لگی تھی، وہی اس کے نین نقش اور وہی اس کی عادتیں، آج سے بہت سال پہلے وہ اپنے بیٹے کو بھی سمجھا نہیں پائی تھیں اور آج

انزلہ کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک دیکھ کر، وہ جان گئی تھی کہ وہ اپنی پوتی کو بھی، کبھی نہیں سمجھا سکیں گی۔

☆☆☆

خالی نہیں رہا کبھی آنکھوں کا یہ مکاں
سب اشک بہہ گئے تو اداسی ٹھہر گئی

بہت سے دن شدید اذیت میں بسر ہوئے تھے اس کے سوچ سوچ کر وہ بے حال ہو گئی تھی کہ آخر سنعان شاہد کو اس کے انجام تک کیسے پہنچائے؟ مگر کوئی راہ سمجھائی نہیں دے رہی تھی۔ دادا ابا، اس کی ماں اور بھائی کے ساتھ، فی الحال شہر میں ہی تھے، اس کی ماما کا خیال تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہی عمرہ کی ادائیگی کے لئے چلیں۔ لہذا وہ ان کی تنگی سے فی الحال آزاد تھی۔

بے حد سوچ و پچار کے بعد جو راہ، انزلہ شاہ کو بھائی دی تھی، وہ سنعان علی شاہ کی موت تھی! گھر میں چھپا کر رکھے گئے، دادا ابا کے تیز دھاری خنجر کو اپنے قبضے میں لے کر وہ اس روز بالآخر، اسے کسی بھی طرح سے مارنے کا قصد کر کے گھر سے نکل آئی تھی۔ باہر ارد گرد گھروں سے اٹھتا دھواں، اس بات کی شہادت تھا کہ اب لوگ ناشتے کی تیاری کر رہے ہیں، کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی کچی دیواروں پر لگے ایلے، اور جگالی کرتے مویشی بھی راہ میں آرہے تھے مگر آج اسے کوئی چیز بھی متاثر نہیں کر پارہی تھی۔ رات بھر سوچ سوچ کر جو حتمی فیصلہ اس نے کیا تھا، آج اسے ہر صورت اپنے اس فیصلے کو عملی تشکیل دینی تھی، گو اس ارادے کے بعد، جھم سے کسی کی دو خوبصورت نگاہیں، اس کے تصور میں آکر اسے تڑپا گئی تھیں مگر..... بہت مشکل سے ہی سہی بہر حال اس نے خود کو سمجھایا تھا کہ وہ جسے مارنے کا عزم لے کر جا رہی ہے وہ اس کا سنعان علی شاہد نہیں، ایک ظالم اور درندہ صفت غنڈا، سنی استاد ہے اور اس کی موت میں ہی سب گاؤں والوں کی نجات ہے۔

صبح کے دھندلے چھٹے، تو دور کہیں سے آتی پن پچکی کی آواز بھی قدرے مدہم ہو گئی۔ تھکے تھکے قدموں سے جس وقت وہ سنی استاد کے ڈیرے تک پہنچی، کافی بڑھ چالی ہو چکی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ ڈیرے کے اندر جا کر اسے تلاش کرتی وہ اسے خود ہی، بلیک شلوار قمیض میں ملبوس، بائیں طرف قدرے فاصلے پر ہاتھ منہ دھونا دکھائی دے گیا۔ آج بھی بے شک وہ حسن و جمال میں بے مثال تھا۔ جانے وہ کب تک یونہی کھڑی، خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی، کہ اچانک خود سنعان کی نگاہ اس پر پڑ گئی، اور وہ کندھے پر پڑے تو لیے سے چہرہ رگڑتے

ہوئے، قدرے حیرانگی سے اس کی طرف چلا آیا۔

”خیریت..... آج تو سورج سے قبل ہی تمہارے درشن ہو گئے، کچھ چاہیے کیا.....؟“ اس کی خاموش سپاٹ نگاہوں میں مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا، جب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوطی سے بولی۔

”ہاں..... آج میں تم سے تمہاری جان مانگنے آئی ہوں، اگر نہیں دے سکتے، تو یہ لو خنجر اور مجھے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔“

اس کے عجیب سے الفاظ پر سنعان نے قدرے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا، پھر اس کی بھیجی ہوئی نگاہوں میں عجیب سی صدا دکھ کر، کچھ پل سر جھٹک کر کچھ سوچا اور بالآخر قمیض کی جیب سے اپنا پستل نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کپکپاتی انگلیوں سے پستل تھام کر انزلہ نے فقط ایک نظر اس کی آنکھوں کی جانب دیکھا، اور اگلے ہی پل، دل مضبوط کر کے سنعان علی شاہد، کے چوڑے سینے کو، اسی کے پستل کی گولی سے داغ دیا۔ گولی چلنے کی تیز آواز فضا میں گونجتے ہی، پرندوں کا شور شروع ہو گیا، جب کہ وہ جیسے وہیں ڈھے کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

جب رات کی ناگن ڈستی ہے
نس نس میں زہرا اترتا ہے
جب چاند کی کرنیں تیزی سے، اس دل کو چیر کر آتی ہیں
جب آنکھوں کے اندر ہی آنسو
زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں
جب جذبول پر چھا جاتے ہو، تب یاد بہت تم آتے ہو
جب درد کی جھانجرجھتی ہے، جب قص غموں کا ہوتا ہے
خوابوں کی تال پہ سارے دکھ، وحشت کا ساز بجاتے ہیں
گاتے ہیں خواہش کی لے میں، مستی میں جھومے جاتے ہیں
تب یاد تمہاری اکثر ہی، اس دل کو بہت ستاتی ہے
تم ہم کو بہت رلاتے ہو
تب یاد بہت تم آتے ہو
”بچاؤ..... وہ..... وہ مجھے مار ڈالے گا، نہیں نہیں، مجھے یہ

پہلے جاؤ یہاں سے.....“ شیشے کے پار کھڑے شانزل علی شاہ کو دیکھ کر، پھر سے وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی، سب بری طرح چلاتے ہوئے، بیڈ کے قریب پڑے ٹیبل سے چیزیں اٹھا اٹھا کر، داخلی دروازے کی طرف پھینکنے لگی پل دو پل کے لئے سچوایشن بدلی تھی، اور ان دو پلوں میں، شاہ کڈ کھڑے شانزل علی شاہ کو حقیقی معنوں میں اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے مقابل کھڑے ڈاکٹر خالد اور ذیشان رحمانی تیزی سے لپک کر سبعین کی طرف بڑھے تھے، مگر وہ جیسے حرکت کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی، سائیں سائیں کرتی سماعتوں اور دھواں دھواں آنکھوں سے، روتی بلکتی حال سے بے حال ہوئی سبعین الہدیٰ کو دیکھ کر، شدت سے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ موت کو گلے لگا لے، ساکت نگاہوں سے وہیں کھڑا، سبعین کو نیند کے انجکشن کے بعد بے حس و حرکت سفید بستر پر سوئے ہوئے دیکھتا رہا۔

”کیا یہ لڑکی، اب بھی ٹھیک نہیں ہوگی، کیا مجھے میرے ضمیر کی خلش سے کبھی چھٹکارہ نہیں ملے گا.....“

انتہائی کرب کے ساتھ سوچتے ہوئے، اس نے قریبی دیوار پر، زبردست مکار سید کیا تھا، عجیب بے بسی میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا وہ خود کو، کہ نہ تو اس کی طرف سے نگاہیں چرا سکتا تھا اور نہ ہی سب کو سچائی بتا کر، اپنی نگاہوں میں سرخرو ہو سکتا تھا، وقت جیسے نہایت ست روی سے ریگ رہا تھا۔

مگر گزرتے وقت کے ہر پل میں، وہ جیسے ریٹم کے گولے کی مانند، ادھرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ راتوں کی نیند اودن کا قرار، دونوں کھو چکا تھا وہ، پچھلے نجانے کتنے دنوں سے اس نے شیونہیں کی تھی، مسلسل بے آرام رہنے کے باعث، اس کی آنکھوں کے گرد بھی سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ذہنی ڈسٹرنس کی وجہ سے، کافی کمزوری بھی در آئی تھی، مگر اسے بھلا اپنی پرواہی کہاں تھی، وہ تو ہر وقت، ہر پل محض سبعین کے متعلق سوچ سوچ کر ختم ہو رہا تھا۔

اس سے قبل اس نے کبھی سگریٹ نوشی نہیں کی تھی، مگر اب وہ محض ایک رات میں، کئی کئی پیکٹ ختم کر دیا کرتا تھا، گوز دیا خان، اب بھی اس کا مکمل خیال رکھ رہی تھی، دن میں ایک دو بار چکر لگا کر، اس کے کمرے کی حالت سنوار دیتی، اس کے بکھرے کپڑے اور کتابیں سمیٹ کر، ان کی اصل جگہ پر واپس رکھ دیتی، اگلے روز کے لئے اس کے کپڑے پرپس کر کے، ہینگ کر جاتی، اکثر کبھی ٹائم ہوتا تو اس کی پسند پر، کئی ڈشز بنا کر، انہیں فریز بھی کر دیا کرتی تھی مگر پھر بھی وہ کبھر رہا تھا۔

وقت جیسے جیسے ریگ رہا تھا، حالات قدرے بہتر ہوتے جا رہے تھے۔ سبعین الہدیٰ کی حالت، پھر قدرے سنبھل گئی تھی، لہذا ڈاکٹر ز نے اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا تھا۔ خود شانزل بھی اب ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے لگا تھا، ذیشان سے آفس میں ہی مل کر اس سے سبعین کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔ حالانکہ ذیشان اسے کتنا فورس کرتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چل کر سبعین سے مل آئے، مگر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر، اسے ٹال دیا کرتا تھا۔ اصل میں وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر سبعین کی حالت، پھر سے مزید خراب ہو جائے، مگر اس روز، وہ اپنے دل کو سمجھا نہیں سکا، صرف ایک نظر اسے دیکھنے کی خواہش، اس قدر بڑھ گئی کہ اسے آفس سے سیدھا، ذیشان کے گھر کے راستے پر گاڑی ڈالنا ہی پڑی۔ سرخ اینٹوں سے تعمیر شاندار ”رحمانی ہاؤس“ بلاشبہ اپنی طرز تعمیر میں بے مثال تھا۔ تب گاڑی کو لاک کر کے، دھڑکتے دل کے ساتھ، وہ خوبصورت لان عبور کرتے ہوئے، وسیع راہداری کی طرف چلا آیا، مگر قریب ہی ہال سے بلند ہوتی، تیز آوازوں نے بے ساختہ اس کے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

”خبرے دیکھو نواب زادی کے، جیسے آسمان سے اتر کر ابھی ابھی زمین پر تشریف لائی ہو، نہ میں پوچھتی ہوں، باپ کی زندگی تو لے چکیں۔ اب ہمیں جان سے مارنے کا ارادہ ہے تمہارا منوس لڑکی، کیوں راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں ہماری، مت بھولو کہ اب تم بی بی پاکدامن نہیں رہیں، جو کوئی دور دیس کا خوبصورت شہزادہ، تمہیں بیاہنے آئے گا، غضب خدا کا، بھائی ہے تو اسے کوئی پروا نہیں، اپنی ہی ریاست کا راج کمار بنا ہوا ہے وہ، اور بہن دیکھو تو اس کے مزاج نہیں ملتے، لے کر ہم رہ گئے ان کی فکریں کرنے والے، ہونہر..... جانے کب جان چھوٹے گی ان سے.....“ شانزل غور نہ بھی کرتا، تب بھی اسے یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دشواری پیش نہ آتی، کہ بلاشبہ یہ نوکیلے پتھر، سبعین الہدیٰ کی معصوم ذات پر گرائے جا رہے تھے، درد کی ایک شدید ٹیس اس کے دل میں اٹھی اور وہ محض تڑپ کر رہ گیا۔

”دیکھو بی بی، اب وہ پہلے سے حالات نہیں رہے، بھول جاؤ وہ سب عیش و عشرت اور محض اتنا یاد رکھو کہ اب ہم میں، مزید تمہارے باز اٹھانے کی ہمت نہیں ہے، لہذا بہتر ہوگا کہ تم اس رشتے کے لئے خود ذیشان کو اپنی رضا مندی دے دو، ورنہ ایک بار فیصل شہزادہ کا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا، تو ساری عمر سر پکڑ کر روتی رہنا پھر.....“ اب کے کسی اور خاتون کا کڑک لہجہ سماعتوں سے ٹکرایا تھا، مگر شانزل میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی، مشرق کی ایک اور بے قصور، مجبور بیٹی، آج ایک مرتبہ پھر، اس کی وجہ سے، ایک مرد کی وجہ سے تکلیف سہ رہی تھی اور نجانے یہ

تکلیف ابھی اسے مزید کس قدر سہنا تھی اس روز وہ رحمانی ہاؤس سے واپس آیا، تو اعصاب بے حد منتشر تھے دل میں عجیب سی بے کلی نے گھر کر رکھا تھا، اس روز زویا خان کی دلفریب مسکراہٹ اور اس کی قربت بھی شانزل علی شاہ کے دل کو بہلانے میں ناکام رہی تھی۔ تبھی اس رات، خوب سوچ و بچار کے بعد، اگلے روز، وہ صبح ہی صبح ذیشان سے ملنے اس کے آفس چلا آیا اور اس سے ادھر ادھر کے احوال کے بعد، بالآخر سبب کے لئے اپنا پرپوزل پیش کر دیا۔

ذیشان رحمانی، جو سبب کی حالت اور گھر والوں کے تلخ رویوں کے باعث خود بے حد ڈسٹرب تھا، شانزل کی اس آفر پر مسرت سے جیسے کھل اٹھا خوشی اور عقیدت اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ بات بات میں، وہ شانزل کے بڑے پن کا معترف ہو رہا تھا، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر گھر جائے اور جا کر اپنی دونوں چچیوں کو بتائے کہ اس کی بہن کو اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی ایک ایسے شخص کا ساتھ نصیب ہو سکتا ہے کہ جس کی قربت اور رفاقت کے لئے، نجانے کتنی ہی حسین لڑکیاں، محض خواب دیکھ سکتی ہیں۔

دن بھر وہ بے حد مسرور رہا تھا اور شام میں اپنے معمول سے قبل ہی، گویا ہواؤں میں اڑتے ہوئے گھر پہنچا تھا۔ شانزل کو بھی فورس کر کے وہ اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا، تاکہ اس کے گھر والے اسے دیکھ کر اس کی وجاہت اور وقار کا اندازہ لگا سکیں، جب کہ سبب کو وہ دوپہر میں ہی فون پر، یہ خوش خبری سنا چکا تھا۔

شانزل، ذیشان رحمانی کی ہمراہی میں، دوسری مرتبہ ”رحمانی ہاؤس“ کی دہلیز تک پہنچا تو پھر سے سببین الہدیٰ کا سامنا کرنے کا تصور اس کا دل دھڑکا رہا تھا، پورے آٹھ ماہ ہو گئے تھے اس کی صورت دیکھے ہوئے، نجانے اب کیسی، کنڈیشن تھی اس کی؟ نجانے اسے پھر سے اپنے سامنے پا کر وہ کیساری ایکٹ کرتی، بس یہی خیالات اسے مضطرب کیئے ہوئے تھے، جب کہ ذیشان رحمانی اسے متعدد بار بتا چکا تھا کہ اب سببین نے زندگی کا نارملی فیس کرنا شروع کر دیا ہے، وہ اب کبھی، آپے سے باہر ہو کر پاگلوں جیسی حرکتیں نہیں کرتی، مگر پھر بھی ایک دھڑکا سا مسلسل دل کو لگا ہوا تھا کہ نجانے، اسے اتنے عرصے کے بعد پھر سے اپنے سامنے دیکھ کر وہ کیا ری ایکٹ کرے گی؟

☆☆☆

خالی خالی سے ساکت نگاہیں لئے۔ وہ گرم سم سی زمین پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے وہ شخص خون میں لت پت پڑا تھا کہ جس کے نام سے بھی گاؤں کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا۔ وہ شیر

تو کیا جانے دل کا درد
دل سی آن والا، مضبوط و توانا مرد، کہ جسے یہ گاؤں کے لوگ محض ایک بدنام غنڈے کی حیثیت سے جانتے تھے، اس نے خود ایک کمزوری لڑکی کے ہاتھوں اپنا ہی، پسٹل تھما کر، خوشی خوشی خود کو موت کے سپرد کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔

وہ سب کے ساتھ قہر بن کر پیش آنے والا غنڈا کم از کم دل کے معاملے میں بڑا کھرا ثابت ہوا تھا۔ فار کی آواز سن کر سنی استاد کے آدمی، بدحواسی سے بھاگتے ہوئے، باہر نکلے تھے ارد گرد تعمیر کئے گھروں کے لوگ بھی سہم کر یا اللہ خیر کا ورد کرنے لگے تھے، مگر وہ پتھر کا بت بنی، مضبوطی سے پسٹل تھامے، پھٹی پھٹی نگاہوں سے، سعان علی شاہد کے چوڑے سینے سے بہتا ہوا سرخ تازہ خون دیکھ رہی تھی۔

گو آج اس نے ایلان جعفری کا بدلہ لے لیا تھا، ساجد حسین کے دل کی بربادی اور رقیقہ کی بیٹی کی عزت لئے کا قرض بھی، چکا لیا تھا اس نے، گو آج اس نے پورے گاؤں والوں کے درد کا مداوا کر دیا تھا، مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اس کا اپنا دل گم سم ہو کر رہ گیا تھا۔ عجیب سے بیٹھے بیٹھے درد نے پہلو میں سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ جھلملاتی نگاہوں سے اس نے سعان کے آدمیوں کو، اس پر جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب کہ وہ خود اپنی تیزی سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولے، تکلیف ضبط کرنے کی کوشش میں غدھال، اپنے آدمیوں کو مدہم لہجے میں ہدایت کر رہا تھا کہ اسے کچھ ہو جانے کے بعد بھی، کوئی انزلہ شاہ کو نقصان پہنچانے کا تصور تک نہ کرے۔

کل اٹاٹھا اک دینا لوگو

اور اب وہ بھی بجھ گیا لوگو

ہم نے چپ چاپ ہار مانی ہے

تم نے تو شور کر دیا، لوگو

وہ بھی خاموش تھا جدائی پر

ہم نے بھی ضبط کر لیا لوگو

ساتھ رہ کر بھی کتنا نادم تھا

کب تلک جھوٹ بولتا، لوگو

زندگی کا سفر، تمہارے بغیر

آخر کار کٹ گیا، لوگو

ہم نے اک روز لوٹ آنا تھا

کوئی تو راہ دیکھتا، لوگو

”شاباش بیٹی، شاباش.....“

دھول اڑاتی راہ میں، وہ بے حس و حرکت خاموش بیٹھی تھی، جب اچانک کسی کی نحیف آواز نے اسے چونکا دیا، قطعی، بے ساختگی کے عالم میں چونک کر سر اٹھاتے ہوئے، اس نے اپنے قریب کھڑی، اس لاغری بڑھیا کو دیکھا تھا، جو آنکھوں میں غصے کی خفیف سی چنگاریاں لئے، نجانے کب سے اسے گھور رہی تھی۔

سبعان شاہ کے آدمی، اسے سرعت سے اٹھا کر ہسپتال لے گئے تھے جب کہ اس نے کس قدر سختی کے ساتھ انہیں ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا، مگر وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے، سو اس بار اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے میں قطعی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

”بس..... مل گیا تیرے دل کو چین.....؟ ہو گئی تو سرخرو.....؟ اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے ناں تجھے.....؟“ نجانے وہ کون تھیں اور کیا کہنا چاہتی تھیں.....؟ انزلہ بس ٹکر ٹکر ساکت نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ارد گرد کے گھروں سے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اور قدرے دلچسپ نگاہوں سے ہسپتال تھاے بیٹھی، انزلہ شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ اب ایسے ٹکر ٹکر میرے چہرے کی طرف کیا دیکھ رہی ہے تو، ان گاؤں والوں کا درو تو بڑا محسوس کیا، مگر اس کی آنکھوں میں تیرتا درد، کبھی دکھائی نہیں دیا تجھے، بڑی آئی ہے لوگوں کو مسیحا بن کر، اس وقت کہاں تھی تو.....؟ جب وہ درد سے تڑپ رہا تھا مگر کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی، کہاں تھی تو اس وقت، جب اس کا سینہ پے درپے زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا، مگر کسی نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم نہیں رکھا، تاک تاک کر حالات نے اتنے پتھر برسائے اس کے زخمی تن پر، کہ آخر..... وہ خود پتھر کا ہو گیا.....“

وہ جو کوئی بھی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں اس وقت انزلہ کے لئے سوائے نفرت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

”یاد رکھنا لڑکی..... اگر اس بچے کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا، تو میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی.....“ اسے مسلسل خاموش پا کر، بڑھیا نے حتیٰ لہجہ میں کہا تھا، جب وہ مزید ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے چلا اٹھی۔

”ہاں مجھے مار دیجئے آپ..... لٹکا دیجئے پھانسی پر..... کیونکہ میں نے خود اپنے

ہاتھوں اپنی محبت کا گلا گھونٹنے کا جرم کیا ہے۔ م..... مگر میں اس کے ظلم مزید نہیں دیکھ سکتی تھی، اس..... اس نے محض ایسا ان کو نہیں مارا، میرے دل کا خون کیا ہے اس نے..... فقط ساجد حسین کی زندگی نہیں اجاڑی، میرے دل کی نگری بھی سنسان کر ڈالی ہے اس نے..... وہ محض رفیقہ کی بیٹی کا مجرم نہیں تھا، م..... میرے نفس کی بے حرمتی بھی کی ہے اس نے، اور آپ کہتی ہیں کہ میں نے اسے کیوں مارا.....؟ اسے نہ مارتی تو اور کیا کرتی میں..... بتائیے..... کیا کرتی میں.....؟“ وہ اب بری طرح سے رو پڑی تھی، تبھی وہ بوڑھی عورت آہستہ سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ایسا کر کے تم اپنی نظروں میں سرخرو ہو گئی ہو.....؟ کیا تمہیں یہ گارنٹی مل گئی ہے کہ اب کہیں، کچھ غلط نہیں ہوگا؟ محض ایک سنی بیٹے کے نہ ہونے سے، کہیں کوئی برائی جنم نہیں لے گی، بولو..... کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے ہر برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے.....؟“

پتہ نہیں وہ اسے کیا سمجھانا، کیا کہنا چاہ رہی تھیں.....؟ کوئی بھی باشعور انسان، کبھی ایسے ہی برائی کی ڈگر پر نہیں چل پڑتا بیٹی..... کچھ محرکات ہوتے ہیں، کچھ وجوہات ہوتی ہیں، جو ایک باشعور انسان کو، گمراہی کی راہ پر گامزن کر دیتی ہیں، مگر وہ پوشیدہ محرکات، وہ وجوہات کسی کو دکھائی نہیں دیتیں، یا شاید کوئی انہیں جاننا ہی نہیں چاہتا، میں مانتی ہوں بیٹی، کہ وہ برا ہے، مگر وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا، وہ ان لوگوں میں سے بالکل نہیں تھا کہ جن کے ضمیر جان بوجھ کر سو گئے ہوتے ہیں، ظلم اور برائی، گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ حالات نے اسے ایسا بن جانے پر مجبور کر دیا، کبھی اس کے آنسو چن کر، اس کے دل کی روداد تو سنی ہوتی بیٹی، پھر فیصلہ کرتیں کہ وہ کس سزا کے قابل تھا.....“ انزلہ اب بھی آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں اٹھائے، ان کی طرف خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”برائی کو ختم کرنے لئے، ہمیشہ طاقت کی ضرورت اہمیت نہیں رکھتی بیٹی، کچھ برائیاں ایسی ہوتی ہیں، جنہیں جوش کی بجائے، ہوش سے ختم کیا جاتا ہے، ہندوق اٹھا کر، برائی کے خاتمے کے لئے نکلیں تو کس کس کو مار سکیں گے بیٹی، یہ معاشرہ تو پورا کا پورا برائیوں سے اٹا پڑا ہے، وہ سبھی لوگ جو برے کاموں میں سنی کے مددگار ہیں، کیا انہیں بھی تم یوں ہی موت کے گھاٹ اتار سکو گی.....؟ نہیں ناں..... تم سب بروں کو کبھی نہیں مار سکتیں.....؟ اب کے بڑھیا کا لہجہ کافی مدہم ہو گیا تھا، تبھی انزلہ کے کپکپاتے ہونٹوں نے بمشکل جنبش کی تھی۔

”تو..... تو پھر میں کیا کروں بڑی ماں..... کیا کروں میں.....؟“

”بروں کی بجائے برائیوں کو ختم کرو بیٹی، پھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے کی پہچان

بہتے زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد بالآخر زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا تھا۔

انزلہ کی ماما اس کے بھائی اور دادا کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لئے سعودیہ روانہ ہو گئی تھیں اور انہیں رخصت کرنے کے دو دن قبل ہی گاؤں سے شہر چلی گئی تھی۔ اب کے اس کا ارادہ مستقل شہر میں رہنے کا ہی تھا مگر یہ دل تھا کہ جسے کہیں قرار ہی نصیب نہ ہو سکا تھا، سودل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایک مرتبہ پھر دادی ماں کے ساتھ گاؤں واپس چلی آئی۔

پہلی بار اس گاؤں میں آئی تھی تو نیندوں پر اس کا اپنا اختیار تھا، وہ زندگی سے بھرپور ہنسی، لبوں پر بکھیر سکتی تھی۔ مگر یہاں آنے کے بعد وہ جیسے ہر راحت سے محروم ہو کر رہ گئی تھی۔ احسن رحمانی کے جدہ جانے سے قبل اس نے اسے ایلان کی انفوس ناک ڈیٹھ کے متعلق بتایا تھا مگر اسے یہ جان کر شدید حیرت کا جھکا لگا تھا کہ وہ ایلان کی ڈیٹھ سے متعلق پہلے ہی باخبر تھا، بس اس پر ظاہر نہیں کیا تھا اس نے۔

وقت نجانے اپنے دامن میں کیسے کیسے بھید چھپائے ہوئے تھا۔ جانے ابھی اور کتنے انکشاف اس سے پوشیدہ تھے۔ بہت سارے دن اداسیوں کی نذر کرنے کے بعد۔ اس روز وہ سعان علی شاہد کے ڈیرے کی طرف آئی، تو جانے کیوں اسے یاد کر کے، خود بخود ہی پکلیں بھیک گئیں۔ وہ جتنا بھی برا تھا، خدا کا گناہ تھا، پھر..... پھر اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اس سے اس کی زندگی کو چھین لیتی.....؟ رہ رہ کر یہی احساس اسے تڑپا رہا تھا۔

قبرستان کے قریب، درختوں کے جھنڈ کے پاس بنے، سعان علی کے ڈیرے پر۔ اس وقت قدرے سکوت تھا، تبھی وہ بچے تلے قدم اٹھاتی، ایک طرف بنے، نسبتاً پختہ کمرے کی طرف چلی آئی۔ اندر قدرے اندھیرے کے ساتھ ساتھ عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ پل دوپل کے لئے اس کا دل ایک عجیب سے خوف سے کانپا تھا، مگر اگلے ہی لمحے وہ خود کو مضبوط کرتی، نسبتاً کم روشنی میں، بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے، آگے بڑھ آئی تھی دل اتنے دنوں کے بعد اسے پھر سے اپنے سامنے دیکھنے کا تصور کر کے دھڑک اٹھا تھا، تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتی، کسی نے سختی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

☆☆☆

”ان سے ملنے..... اس ملک کے مانے ہوئے بزنس مین ہیں اور میرے بہت اچھے دوست بھی.....“

نہایت پر جوش انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر، وسیع حال میں داخل ہوتے ہی ذیشان

کراؤ..... یہاں ہندوق اٹھا کر جوش سے کام لینے والے تو بہت مل جائیں گے تمہیں، مگر ہوش سے کام لے کر، بگڑے ہوؤں کو سنوارنے کی فرصت کسی کے پاس نہیں ہے..... اگر ایک بار یہ قافلہ چل پڑے تو شاید سبھی کا بھلا ہو جائے، نیکی اور بھلائی کی خوشبو جب پھیلتی ہے تو لازمی طور پر دل اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں بیٹی، دیکھا دیکھی تو یہ کرنے کا ترجمان، سب کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ بس ضرورت صرف اس سفر پر، سینہ سپر ہو کر نکلنے کی ہے۔“ انزلہ تو سمجھتی تھی کہ محض اس کی دادی ماں کو ہی اچھا بولنا آتا ہے، مگر آج اس بوڑھی عورت کی باتیں سن کر اسے اپنا یہ قیاس جھٹلانا پڑا تھا۔

”اب جاؤ بیٹی، تمہاری دادی تمہارے لئے پریشان ہو رہی ہوں گی“

اس کی خاموشی پر وہ پھر سے حلیم لہجے میں اس کی غم آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں تھیں اور کچھ ہی لمحوں میں اس کے پاس سے اٹھ کر ڈیرے کے اندر ہی نجانے کس کونے میں گم ہو گئی تھیں۔

یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
جدھر جدھر اٹھے نظر کچھ کی سی لگتی ہے
بجھی بجھی ہیں فضا میں، دھواں دھواں لگے جہاں
ہوائیں بھی اگر چھوئیں، جلائیں ہم کو خوشبوئیں،
چراغ کی یہ روشنی بھی
سانولی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
لہو ہو ہے آرزو
غبارے چہار سو
کبھی گماں کبھی یقین، قدم کہیں نظر کہیں
جو ہوش میں بھی ہم رہیں تو بے خودی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے

اگلے کچھ دن گنیمہ اداسیوں کی نذر ہو گئے تھے۔ سعان علی شاہد کو گولی لگنے کے بعد گاؤں کے لوگوں میں عجیب سا اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ گو انزلہ کے غلط نشانے کے باعث گولی اس کے دل کی بجائے کندھے کو چیرتے ہوئے نکلی تھی مگر اس کے باوجود وہ شہر میں پورے ایک

لڑکی نے اپنی نگاہیں بغور شانزل کے خوبرو چہرے پر جماتے ہوئے، ایک خاص ادا سے پوچھا تھا، جب وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”جس حادثے کا وہ شکار ہوئی ہیں، اس میں سبعین کا تو کوئی قصور نہیں یہ تو کہیں..... کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا، چاہے تو آپ کے ساتھ بھی، بحر حال میں ایسی بیکار سی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا، وہ میرے لئے پہلے بھی قابل احترام تھیں اور اب بھی اتنی ہی قابل احترام ہیں.....“ شانزل کے الفاظ پر لڑکی نے ناک چڑھا کر ناگواری کا اظہار کیا تھا، پھر اگلے ہی لمحے وہاں سے اٹھ کر لاؤنج سے، نکل بھی گئی تھی۔

”شان، یہ میری چھوٹی چچی کی اگلی بیٹی تھی، اور یہ بڑی چچی کے ہونہار سپوت قاسم ہیں.....“ لڑکی کے بی ہونے پر شدید خفت محسوس کرتے ہوئے دیشان نے فوراً ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش کی تھی، جب دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھی، دیشان کی چھوٹی چچی صلبہ بولیں۔

”بھئی اس گھر کے تمام فیصلے کرنے کا اختیار تو اس گھر کے مردوں کو ہی حاصل ہے، سبعین کے لئے کچھ اور بھی پر پوزل زیر غور ہیں، تاہم حتمی فیصلہ تو اس کے چچا ہی کریں گے.....“ دیشان کو ان سے اس قدر بے مروتی کی توقع نہیں تھی، کیونکہ وہ گھر میں ان دونوں کے ”اختیارات“ سے بخوبی واقف تھا، تبھی شاید اسے، شانزل کے ساتھ اپنائے گئے ان کے رویہ پر شدید ٹھیس پہنچی تھی، مگر انہیں بھلا پہلے کبھی ان، لوگوں کی ٹھیسوں سے کوئی فرق پڑا تھا، جو اس وقت پڑتا۔

”کم آن شان..... دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چچا وغیرہ سے میں خود ہی بات کر لوں گا، بحر حال مجھے تو تم دل و جان سے بے حد پسند ہو.....“ مسکرا کر شانزل، کا ہاتھ تھامتے ہوئے، اس نے گویا اپنے گھر والوں کے ناروا رویوں کی تلافی کرنا چاہی تھی۔ جب ہال کے ایک کونے میں کب سے خاموش کھڑی، سبعین الہدی، لبوں پر خاموشی کے پھرے کو مزید قائم نہ رکھ سکی۔

”مگر..... مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہیں بھیا.....“

آف وائیٹ کاٹن کے سادا سے سوٹ میں ملبوس، سبعین الہدی کی آواز، وسیع ہال میں یوں گونجی جیسے کسی ساکن مکان میں اچانک غیر متوقع آوازیں آنا شروع ہو جائیں، اس وقت اس کے الفاظ نے لاؤنج میں، بیٹھے ہر شخص کو شاکد کر ڈالا تھا، دیشان رحمانی کی حالت تو دیکھنے لائق تھی، پھٹی پھٹی نگاہوں سے قطعی بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے، وہ

رحمانی نے اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ لاؤنج میں اس وقت ایجنڈ خواتین کے ساتھ ساتھ ایک بیک لڑکا اور لڑکی بھی، براہمان تھے، جبکہ دیشان کی گاڑی کا مخصوص ہارن سن کر، آف وائیٹ کپڑوں میں ملبوس بھیجی سی سبعین بھی، اپنے کمرے سے نکل کر، ہال میں چلی آئی تھی۔ مگر دیشان کے ساتھ کھڑے شانزل علی شاہ کو دیکھ کر، پل دوپل کے اندر ہی، اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ شفاف نگاہوں سے غصے کی چنگاریاں پھوٹ پھوٹ کر شانزل کے مسکراتے چہرے کو جھلسانے لگی تھیں۔ ضبط کے مارے اس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھیجنے لیں تھیں۔ مگر لب سے ایک حرف تک نہیں نکالا۔

”بیٹھو بیٹا..... اسے اپنا ہی گھر سمجھو“

اس کی ظاہری وجاہت دیکھ کر، بالکل سامنے بیٹھی، نسبتاً موٹی خاتون نے کہا تھا، جبکہ اس کے دائیں طرف پہلو میں بیٹھی، قدرے سانولی سی خاتون کی آنکھوں میں بھی۔ شانزل کے لئے بے حد ستائش تھی۔ شانزل نے انکساری سے فرداً فرداً سب کو سلام کہا پھر سامنے ہی سنگل صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔

”چچی..... شان کے والد صاحب کی بھی کچھ ماہ قبل ڈیٹھ ہو گئی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی ایسا بزرگ نہیں جو یہاں آسکتا ہو، سو اس نے سبعین کو دیکھنے کے بعد، مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ سبعین کو ہمیشہ کے لئے اپنا نا چاہتا ہے۔“ دیشان نے اس کی طرف سے مدعا بیان کرنے کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ تاہم وہ اس کے الفاظ پر مقابل بیٹھی۔ خاتون کی آنکھوں میں واضح حیرانگی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

”اچھا..... مگر سبعین کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی ہے کیا اس سے باخبر ہیں یہ.....؟“

پہلے کی نسبت اس بار دیشان کی چچی کا لہجہ قدرے گھردرا تھا، مگر شانزل نے دیشان کے کچھ کہنے سے قبل ہی اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

”جی آئی، میں سبعین کے ساتھ ہونے والی تمام ٹریجڈی سے باخبر ہوں، مگر اس کے باوجود، میں اسے اپنا نا چاہتا ہوں.....“ اس کے الفاظ نے جہاں ان دونوں خواتین کو حیرانیوں کے سمندر میں غوطہ زن کیا تھا، وہیں قریبی صوفے پر بیٹھے نوجوان لڑکے اور قدرے مغرور سی لڑکی نے بھی، بے حد چونک کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”ویل..... لیکن آپ اتنے ہینڈسم، اتنے امیر ہو کر بھی، ایک عام سی بدنام لڑکی کو، کیوں اپنا نا چاہتے ہیں.....؟“ تنگ حیز، اور بغیر بازوؤں والی شرٹ میں ملبوس، اس ماڈرن سی

بمشکل بڑبڑایا تھا۔

”م..... مگر کیوں سبعتین.....؟“ اپنی سماعتوں پر اسے بالکل بھی یقین نہیں رہا تھا جب وہ خضر بھری ایک نگاہ، شانزل کے شاکد چہرے کی طرف ڈالتے ہوئے، مضبوط لہجے میں بولی۔

”میں اپنی زندگی کو اب اپنی مرضی سے گزارنے کا اختیار رکھتی ہوں بھیا، بڑی چچی نے میرے لئے فیصل شہزادہ کے گھر والوں کو ہاں کر دی ہے، لہذا میں ان کا سر نیچا ہوتا نہیں دیکھ سکتی، مجھے یقین ہے کہ یہ میرے لئے کچھ برا نہیں چاہ سکتیں.....“

اس وقت اس کے ہونٹ اس کی آنکھوں کی نفی کر رہے تھے، ذیشان اور شانزل کے ساتھ ساتھ، خود بڑی چچی بھی، اس کے سفید جھوٹ پر حیران رہ گئی تھیں، تاہم اس نے شانزل جیسے شاندار بندے کے لئے انکار کیوں کیا، یہ معنی الحال وہ بھی نہیں سمجھ پائی تھیں۔

”تو..... میں..... کیا میں تمہارا کچھ نہیں لگتا، کیا مجھے تمہاری بھلائی سوچنے کا اختیار نہیں ہے، کیا میں برا چاہوں گا تمہارا.....؟“

سبعتین کے الفاظ نے اسے اس قدر ہرٹ کیا تھا، کہ اس کا دل دکھ سے بھر آیا، شانزل تو فوراً ہی دکھ بھری ایک نگاہ اس کے سادہ سے چہرے پر ڈال کر وہاں سے چلا گیا تھا، مگر وہ حقیقی معنوں میں شدید ڈپریشن ہو کر رہ گیا تھا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے بے حد پیار کرتی ہوں بھیا، بابا کے بعد آپ ہی تو ہیں کہ جن کی طرف دیکھ کر، میں اپنے زندہ ہونے کا یقین کر پاتی ہوں، میری رسوائی کے بعد، جب تمام لوگوں نے مختلف بہانوں سے میرا جگر پاش پاش کیا، تو آپ ہی کے سینے پر رکھ کر، میں نے اپنے سارے آنسو بہائے تھے، میں اب اپنی زندگی پر، کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی بھیا، لہذا پلیز..... مجھے میرے طریقے سے جینے کا اختیار دے دیں، پلیز.....“ پل میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں، ذیشان ہر طریقے سے اسے فیصلے سے باز رکھنا چاہتا تھا، مگر وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی، اس کی ضد کے سامنے ہار گیا۔ شانزل نے اس دوران، اس سے صرف ایک ملاقات کے لئے، ایڑھی چوٹی کا زور لگا چھوڑا تھا، مگر وہ کسی بھی طور اپنے کمرے سے نکلنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ حالات نے یک لخت ہی اپنا رخ بدلا تھا پھر وہ پھولوں سی پاکیزگی رکھنے والی، نازک سی لڑکی اپنے بھائی کی پر خلوص دعاؤں تلے ”رحمانی ہاؤس“ سے رخصت ہو کر ”احمر ولاج“ کے اونچے درو دیوار کی زینت بن گئی۔ فیصل شہزادہ احمر، بظاہر سلجھا ہوا، مگر ادھیڑ عمر برنس مین تھا، حقیقی معنوں میں اسے ایک بیوی نہیں، بلکہ اپنے بچوں کی بہتر پرورش کے لئے آیا کی ضرورت تھی،

سوسبعین کی صورت ”یہ آیا“ اسے با آسانی دستیاب ہو گئی تھی۔ ہنسنا بولنا تو پہلے ہی بھول چکی تھی وہ، اب شادی کے بعد تو گویا، وہ سانس بھی، یاد کر کے لینے لگی تھی۔ جس روز وہ ”رحمانی ہاؤس“ سے رخصت ہو کر ”احمر ولاج“ آئی تھی۔

وہ پوری رات شانزل علی شاہ نے، تڑپ تڑپ کر سکتے ہوئے، سگریٹ پھونک پھونک کر سخت عذاب میں مبتلا تھی۔ مگر خود سے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ سبعتین الہدیٰ سے محبت کرتا ہے۔ اگلے روز اسے بہت تیز بخار نے آگھیرا تھا۔ لہذا وہ آفس بھی نہ جاسکا۔ آفس سے اسے غیر حاضر پا کر، زویا خان فوراً اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے پاس چلی آئی تھی۔

”کیا ہوا شانزل صاحب، یہ بخار کیوں طاری کر لیا خود پر.....“

وہ جب منڈ میں ہوتی تھی، تو اسے یونہی مخاطب کرتی تھی، تاہم اس کے سوال پر ایک خفیف سی مسکراہٹ شانزل علی رضا کے لبوں کو چھو کر گئی۔

”پتہ نہیں یار..... شاید آج کل میں اپنا خیال نہیں رکھ پا رہا.....“ اس کے مدہم لہجے پر زویا خان نے بہت غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تھا، پھر بے مقصد ہی، ہلکا سا قہقہہ لگا کر قدرے فریٹش لہجے میں بولی۔

”اپنا خیال نہیں رکھ پا رہے، یا محبت کو کھودینے کا درد غڈ حال کر رہا ہے.....؟“

”شٹ اپ..... کتنی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا، کوئی رشتہ نہیں ہے میرا اس کے ساتھ.....“ زویا خان کے فریٹش لہجے پر یک لخت ہی وہ ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے چلا یا تھا، جب وہ پھینکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

”اچھا..... تو پھر یہ آنکھیں کیوں آپ کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے پا رہیں.....؟“ کبھی کبھی وہ واقعی اسے شدید ہرٹ کر جایا کرتی تھی، اس وقت بھی وہ خود کو اس کے سامنے قطعی بے بس تصور کر رہا تھا۔

”زویا پلیز..... سٹاپ دس ٹاپک..... آئی ایم آل ریڈی ویری ڈسٹرب.....“

”اوکے..... مگر اب آپ کو اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہیے..... ساری عمر یوں کڑھ کڑھ کر تو بسر نہیں کی جاسکتی نا.....“ کمرے میں ادھر ادھر بکھیرا فالتو کا سامان سمیٹتے ہوئے، وہ مسلسل جھوگفتگو تھی۔ جب شانزل نے اکتا کر آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

اب بھی شاعر اہوں کس کی خاطر رہوں

کون ہے وہ جو میرے لفظ و معنی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے

آنسوؤں میں چھپے درد چننا پھرے

اور خواب بنتا پھرے

کون ہے جو میرے خون ہوتے ہوئے دل کی آواز پر

اپنی آواز کے ہونٹ رکھتا پھرے

کون آنکھیں میری دیکھ کر یہ کہے، کیا ہوا جانِ جان

کب سے سوئے نہیں

اس سے پہلے تو تم اتنا روئے نہیں

اب بھلا کس لئے، خوب صورت سی آنکھیں پریشان ہیں

اپنی حالت پہ خود اتنی حیران ہیں

کون بے چین ہو، کون بے تاب ہو

موسم ہجر کی شام تنہائی میں، آبلہ پائی میں

کون ہو ہمسفر، گرد ہے راہ گزر

کوئی رستہ نہیں، کوئی راہی نہیں، در پہ دستک کی کوئی گواہی نہیں

دل کے ویران و برباد صفحات پر

جس قدر لفظ لکھے تھے بیکار ہیں

ایک لمبی جدائی کے آثار ہیں

سوچتا ہوں کہ اب، ان خیالوں سے خوابوں سے باہر ہوں

کیوں میں شاعر رہوں، کس کی خاطر رہوں؟

زویا خان اس کا کمرہ سنوار کر، اس کے لئے چکن سوپ اور بخنی بنا کر، نجانے کب کی

واپس جا چکی تھی۔ مگر وہ تاحال اپنے بستر پر چت لیٹا، سبوعین الہدیٰ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ

انتابرا تو نہیں تھا کہ اسے یوں حقارت سے رد کر دیا جاتا، اس نے تو خلوص دل سے سبوعین کو اپنا

کر، اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے کا نیک ارادہ کیا تھا، مگر اس بے وقوف سی ضدی، لڑکی نے یہ

سبب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اسے، پہلو میں دل، جیسے عجیب سے درد کی گرفت میں آچکا تھا۔

مگر اس نے یہ دل کا درد، اپنی ذات پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ دروازے پر بیل مسلسل جاری

تھی، مگر نجانے کیوں چوکیدار اس طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ تب بمشکل ہمت کر کے وہ

بستر سے اٹھا اور تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا گیٹ تک چلا آیا، مگر یہ کیا.....؟ گیٹ پر کھڑی شخصیت

کو دیکھ کر اسے زبردست دھچکا لگا تھا۔

☆☆☆

اگر اس درد میں جلنا ہی مقدر ٹھہرا

اپنی اجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں

ہم وہ شعلے ہیں جو بجھ کر بھی دماغوں میں جلیں

”دشش..... بہت دنوں کے بعد وہ آج چین کی نیند سویا ہے بیٹی، مت جگانا

اسے.....“ وہی بوڑھی خاتون جو سعنان کی ہمدرد بن کر اس سے ملی تھیں۔ اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے بولیں تو انزلہ شاہ خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔

”اب کیسی طبیعت ہے اس کی.....؟“ قطعی دھیسے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب

وہ اسے دوسرے کمرے میں لے جاتے ہوئے بولیں۔

”پہلے سے کافی بہتر ہے، زخم بہت گہرا تھا، اوپر سے وہ خود اپنی جان کا دشمن بنا ہوا

ہے۔ کوئی دوا، کوئی غذا انہیں کھا رہا نجانے کیا ہو گیا ہے اسے.....“

”آ..... آپ کیا لگتی ہیں اس کی.....؟“

سعنان کے ساتھ والے کمرے میں، بڑھیا کے پاس چار پائی پر بیٹھے ہوئے اس نے

پوچھا تھا۔ جب وہ اپنے کام سے ہاتھ روک کر سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا ہے وہ میرا، میں نے ہی پالا ہے اسے..... محض تین سال کا تھا۔ جب اس کی

ماں نے اسے میری جھولی میں ڈال دیا تھا، بہت پیار کرتا ہے مجھ سے.....“

”او..... آئی..... سی..... لال..... لیکن..... اس کے اپنے والدین کہاں ہیں.....؟“

اس کے مختصر سوال پر، پھر قدرے خاموشی کا وقفہ آیا تھا، تاہم کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے بتایا۔

”بہت آباد اور ہشتا بتا گھر انہیں تھا میرے سنی کا، مگر کسی ظالم کی نظر کھا گئی اسے، سب

کچھ بکھر گیا، کچھ بھی نہیں رہا.....“ انزلہ، بوڑھی خاتون کی آنکھوں میں چھائی، اداسی کی دبیر تہہ کو

بخوبی محسوس کر سکتی تھی، تاہم پھر سے ہمت کرتے ہوئے بولی۔

”سعنان کے ساتھ خواہ کچھ بھی ہوا ہو، مگر اس نے ان گاؤں والوں کے ساتھ جو

سلوک روا رکھا ہوا ہے۔ وہ قابل ستائش تو نہیں بڑی ماں، اس نے جو کچھ رفیق چاچا کی بیٹی کے

ساتھ کیا اور اس نے ایلان، ساجد حسین کی زندگیاں جس طرح سے برباد کیں۔ کیا اس پر وہ کسی

سزا کا مستحق نہیں.....؟“

”ہوں..... کیا جانتی ہے تو رفیق کی بیٹی اور ایلان کی موت کے بارے میں.....؟“
اب کے بڑھیا کے سوال نے اسے چونکا دیا تھا، تبھی انزلہ شاہ نے انہیں وہ تمام کہانی
کہہ سنائی، جو اس نے خود اپنی دادی ماں سے سنی تھی۔

”اچھی کہانی ہے، مگر سچائی سے خالی ہے بیٹی.....“ ایک دوسرا دھماکہ ہوا تھا۔ بھلا
دادی ماں غلط بیانی کیسے کر سکتی تھیں؟

”تو نہیں جانتی..... تجھے کچھ بھی نہیں معلوم..... معلوم ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ گاؤں
والے تو میرے سنی کے خون کے پیاسے ہیں تو ادھر آ میرے ساتھ، میں تجھے دکھاتی ہوں سچائی
کیا ہے.....؟“

بالکل اچانک انزلہ شاہ کا ہاتھ تھام کر وہ بوڑھی خاتون اپنے چھوٹے سے کمرے
سے نکل کر سنعان علی شاہد کے کمرے میں چلی آئی۔ انزلہ نے کن اکھیوں سے بغور اس کی
طرف دیکھا تھا، قدرے بوڑھی ہوئی شیو، مسلے ہوئے کپڑوں، اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے
ساتھ، گہری نیند میں ڈوبا وہ شخص سنعان علی شاہد تو نہیں تھا۔ بڑھیا اس کا ہاتھ تھام کر، اسے مزید
سنعان کے قریب لے گئی۔

”یہ اس کی گردن پر لگے زخموں کے نشان دیکھو بیٹی، تمہیں یہ گھاؤ اس کے پورے
بدن پر جا بجا دیکھنے کو ملیں گے.....“ واقعی اس کی گردن کے بائیں طرف لگے گہرے زخم کے
مندل گھاؤ کو دیکھ سکتی تھی۔ تبھی بڑھیا، اسے پھر سے اپنے کمرے کی طرف لے آئی۔

”وہ تو جب بھی شہر سے یہاں آتا تھا فقط تمہاری ہی باتیں کیا کرتا تھا، بڑی ماں وہ
ایسی ہے، یوں ہنسی ہے، وہ یوں بولتی ہے۔ بس تیرا ہی تذکرہ ہوتا تھا اس کی زبان پر، مگر پچھلے
سال جب وہ یہاں آیا تو رفیق کی بیٹی نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ سنی بیٹے نے
میرے سامنے اسے ڈانٹ کر سمجھایا، مگر وہ نہیں سمجھی، کتنے ہی دنوں تک وہ سنی کو خط لکھتی رہی، مگر
یہ اسے نظر انداز کرتا رہا، پھر جب رفیق نے رشیدے کے بیٹے کی پسند پر، اپنی بیٹی کا رشتہ اس
کے ساتھ طے کیا، تو وہ بھاگ کر سنی بیٹے کے پاس ڈیرے پر چلی آئی۔ اس نے سنی بیٹے کو دھمکی
دی کہ اگر وہ اسے قبول نہیں کرے گا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ سنی نے اسے سمجھایا اور
ڈانٹ ڈپٹ کر، گھر واپس بھجوا دیا، مگر اس کرموں جلی نے گھر پہنچ کر یہ واویلا مچا دیا کہ، سنی بیٹے
نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس سے اس کا مقصد محض اس کو پریشان کرنا اور اپنی توہین کا
بدلہ لینا تھا۔ مگر اس کی حماقت پر کئی زندگیوں کو گرہن لگ گیا۔ ایلان بیٹا تھوڑا جو شلا تھا، اس

نے جو رفیق کی زبانی، جھوٹی کہانی سنی، تو سنی سے جھگڑنے چلا آیا۔ سنی تو پہلے ہی تمہاری وجہ
سے، اس سے جلتا تھا، لہذا اب جو اس نے ایک بالکل جھوٹی بات کو بنیاد بنا کر، سنی بیٹے کے
کردار پر کچڑا اچھالا تو وہ اسے معاف نہ کر سکا، ایلان نے آتے ہی اینٹ اٹھا کر سنی بیٹے کے سر
پر ماری تھی، اتفاق سے اس وقت سنی بیٹے کے پاس کچھ پولیس والے بھی بیٹھے ہوئے تھے، لہذا
سنی نے ایلان کو طیش میں آ کر ان کے حوالے کر دیا۔ ادھر رفیق کی بیٹی نے انتہائی جذباتی قدم
اٹھاتے ہوئے خودکشی کر لی۔ اس واقعہ کے بعد گاؤں والے سنی بیٹے سے اور بھی نفرت کرنے
لگے۔ رشیدے کا بیٹا، ساجد حسین، رفیق کی بیٹی کو دل سے بہت چاہتا تھا، مگر وہ بھی ان گاؤں
والوں کی طرح آج تک اندر کی حقیقت سے بے خبر ہے، لیکن میں تمہیں وہ خط دکھاتی ہوں جو
رفیق کی بیٹی نے لگا ہے۔ لگا ہے سنی کو لکھے تھے.....“ اپنی طویل کہانی انجام تک پہنچانے کے بعد وہ
سرعت سے اٹھ کر ایک ٹوٹے پھوٹے پرانے صندوق کی طرف گئیں اور اس میں سے تھوڑی سی
کوشش کے بعد، ایک کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر لے آئیں۔

”یہ لے بیٹی، انہیں پڑھ کر حقیقت کو جان لے، سنی بیٹے کو تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں
نے ان خطوط کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے، اس نے تو جیسے اپنی صفائی میں، کچھ بھی نہ کہنے کی قسم کھا
رکھی ہے.....“

خطوط کا پلندہ، انزلہ شاہ کے حوالے کرتے ہوئے، وہ پھر سے قدرے دھکی ہوئی تھیں،
جب انزلہ نے سن دماغ کے ساتھ، باری باری ان کاغذوں کو کھول کر، ان پر اپنی خالی نگاہیں دوڑانا
شروع کر دیں۔ ایک ایک خط میں، واقعی اس قدر جذباتیت کے ساتھ اظہار محبت کا اظہار کیا گیا تھا
کہ وہ خود شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گئی تھی پھر ہر خط میں جہاں، لڑکی نے اپنی جوشیلی محبت کا یقین
دلایا تھا، وہیں سنعان بے اس کی بے نیازی اور سنگدلی کا گلہ بھی ضرور تحریر کیا تھا۔ انزلہ کی سمجھ میں
تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ حقیقت جان لینے کے بعد اب کیا کرے.....؟

”اب تو حقیقت جان گئی ناں تو.....؟ تو اب..... اب تو ہی میرے بیٹے کو پھر سے
انسان بنا دے بیٹی، وہ پیارا کا ترسا ہوا ہے۔ نفرتوں اور بددعاؤں کے تمانچے کھا کھا کر بے حس
پتھر بنا ہوا ہے وہ، خدا کے لئے اسے سیدھے راستے پر لے آ، اپنی محبت کے مرہم سے، اس کے
من پر لگے سارے گھاؤ دھو ڈال، تجھے تیری اچھائی کا واسطہ بیٹی، اس پیارے نبی صلی اللہ علیہ
والہ وسلم کا واسطہ کہ جنہوں نے خود اپنے حسن سلوک سے تلوار کی بجائے، پیار سے بڑے بڑے
سورماؤں کو ہدایت کی راہ پر گامزن کیا، میرے سنی کو زندگی کی طرف واپس.....“

خدا کا واسطہ.....“ بڑھیا نے باقاعدہ روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔ تو وہ جیسے شاک کی کیفیت سے باہر نکل آئی۔

”ہاں بڑی ماں..... اسے واقعی حالات نے بھٹکا دیا ہے، مگر میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اسے پہلے والا سنعان بنا کر رہوں گی، اسے سنی دادا کی گرفت سے نکال کر سنعان علی شاہد کی ذات تک واپس لاؤں گی میں، پھر اس کے لئے خواہ مجھے کتنی ہی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ اب میں قطعی پیچھے نہیں ہٹوں گی.....“ بڑھیا نے اس کی آنکھوں میں پختہ عظم دیکھ کر سکون سے پلکیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

تم..... تم.....؟“ گیٹ کے پار کھڑی ٹڈھال سی سحرش خان کو دیکھ کر، اس کی آنکھوں میں طیش کے ساتھ ساتھ، حیرانگی پھیلی ہوئی تھی، جب وہ فوراً بلک کر اس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولی۔

”مجھے معاف کر دیجئے بھیا، میں اپنے کئے پر سخت نادم ہوں۔ خدا کے لئے میرا یقین کریں، میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا ایک غلط اٹھا ہوا قدم، اتنا طوفان لے آئے گا بھیا.....“ وہ بری طرح سسک رہی تھی، جب شانزل نے ایک جھٹکے سے اپنے قدم اس کی گرفت سے آزاد کر والئے۔

”یہی تو المیہ ہے تم جیسی بے وقوف لڑکیوں کا، جو اپنے باہل کے گھر کی پناہ گاہوں کو روند کر جاتے ہوئے کچھ سوچتی ہی نہیں، کبھی یہ سمجھتی ہی نہیں کہ اپنی لا حاصل خواہشات کی چاہ میں، وہ جن رشتوں کو پامال کر کے جا رہی ہیں، وہ اس تذلیل کے بعد زندہ کیسے رہیں گے، تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں سحرش، جو یہ احساس دلاتی ہیں کہ کاش انہیں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا ہوتا، اب یہاں کیا لینے آئی ہو تم.....؟ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں رہا، نہ کوئی رشتہ، نہ کسی رشتے کا کوئی احساس.....“ وہ یقیناً پلٹ کر اس کی طرف نگاہ کرتا تو اپنا ضبط کھو بیٹھتا۔ تبھی سلگتے ہوئے لہجے میں چبا چبا کر بولا تو وہ پھر سے رو پڑی۔

”بھیا..... ادھر..... ادھر میری طرف دیکھ کر بات کریں..... آپ..... آپ نے ہمیشہ میری غلطیوں پر مجھے معاف کیا ہے، آ..... آپ کو یاد ہے، میں بچپن میں کیسے آپ کی قیمتی ڈائریوں کے صفحات پھاڑ کر بھاگ جایا کرتی تھی، کبھی آپ کے پسندیدہ ڈیکوریشن پیسر کو جان بوجھ کر توڑ دیا کرتی تھی، کتنے بڑے بڑے نقصان کر دیا کرتی تھی میں آپ کے، مگر آپ نے

کبھی مجھے نہیں ڈانٹا، ہمیشہ پیار کر کے سینے سے لگایا۔ میری پسند کی معمولی سے معمولی چیز تک کے لئے، کبھی مجھے ترسنے نہیں دیا، تو پھر..... پھر اب مجھے در بدری کی سزا کیوں دے رہے ہیں، بھیا، زندگی میں پہلی بار مجھے میری پسندیدہ چیز سے محروم رکھ کر، مجھے اذیت ناک سزا دے رہے ہیں آپ..... کیوں.....؟ کیا اب آپ میرے بھیا نہیں رہے۔ کیا اب میں آپ کی سحر نہیں رہی بولیے.....“ آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں لئے وہ اس کے سامنے آئی، تو وہ واقعی اپنا ضبط ہار گیا۔ لپک کر اسے بانہوں میں چھپاتے ہوئے، وہ اپنا حوصلہ کھو بیٹھا۔

”سحر..... سحر..... پاپا نہیں رہے، تم..... تم نے اس بار میرا بہت بڑا نقصان کر دیا سحر، بہت بڑا نقصان کر دیا تم نے.....“ وہ بچوں کی طرح بلک کر رو بھی رہا تھا اور اس سے گلہ بھی کر رہا تھا، جواب میں وہ اس سے بھی بلند آواز میں روتے ہوئے مسلسل معافی کی استدعا کر رہی تھی۔ اچھی طرح دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد، دونوں بہن بھائی، غم کی کیفیت سے باہر نکلے، تو ایک دوسرے کا احوال دریافت کیا۔ جواب میں شانزل نے اسے مختصر لفظوں میں اپنے ساتھ بیٹا سانحہ، کہہ سنایا، جسے سن کر وہ واقعی تڑپ اٹھی۔

”یہ..... یہ تو واقعی بہت برا ہوا بھیا، خدا کرے میں مر جاؤں، میری وجہ سے کتنے لوگوں کو اذیت سہنا پڑی.....“ اس کے آنسو پھر سے رواں ہوئے تو بھیگی پلکیں رگڑتے ہوئے شانزل علی شاہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”بری بات سحر..... مرنے کی باتیں نہیں کیا کرتے، اب یہ بتلاؤ، تم نے کچھ کھایا پیا بھی یا نہیں.....؟“

”نہیں بھیا، اصل میں، میں بہت زیادہ ڈیپریس تھی کہ نجانے آپ مجھے پھر سے اپنے روبرو دیکھ کر کیسا ایکٹ کریں، میرا یقین کریں بھیا، اس گھر سے نکل کر، جو پچھلے تین ماہ میں نے بیتائے ہیں، وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے، کوئی رات بھی ایسی نہیں، کہ جس میں مجھے سکون کی نیند آگئی ہو.....“

سحرش کے گھر واپس لوٹ آنے کی خوشی میں، اگلے ہی ہفتے شانزل علی شاہ نے قریبی دوستوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی پارٹی، اریج کی تھی، جس میں ذیشان رحمانی کے تمام گھروالوں کی شرکت پر خصوصی اصرار کیا گیا تھا، دل کے کسی کونے میں موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ سحرش سے مل کر اسے دیکھنے کے بہانے ہی چلی آئے، مگر..... وہ نہیں آئی۔ شانزل نے اس پارٹی میں، ذیشان کی باقاعدہ، رضامندی کے بعد، سحرش اور ذیشان کی انجمنٹ کا اعلان کیا، تو محفل

آفر کی تھی، مگر شانزل کی توقع کے عین مطابق، اس نے بڑی سختی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
 ”نہیں میں ٹیکسی لے کر چلی جاتی ہوں، ویسے بھی یہاں قریب ہی تو جانا ہے مجھے۔۔۔“ کپکپاتے ہونٹوں سے کہنے کے ساتھ ہی، سحرش کے خلوص کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی، جب کہ شانزل اپنی دھواں دھواں سی نگاہوں میں دیر تلک اس کا عکس لئے۔ اسے ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آج پھر دل میں چھپے درد نے انگریزی لے کر، اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا اور آج پھر، وہ ضبط سے مسکراتے ہوئے اس درد سے نگاہیں چرا گیا تھا۔
 دو ماہ کا مختصر سا وقت پر لگا کر اڑ گیا، اور ”رحمانی ہاؤس“ کے ساتھ ساتھ ”شان پیلس“ میں بھی خوشی کے شادیانے بج اٹھے۔ دونوں گھرانوں میں خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ، ہر فنکشن کو سیلبریت کیا جا رہا تھا۔ اس روز مہندی کا فنکشن تھا اور دلہا کے گھر والوں نے مہندی لے کر دلہن کے گھر آنا تھا۔ فنکشن کی مناسبت سے شانزل نے اپنے پورے گھر کو، دلہن کی مانند سجا دیا تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس، نفاست سے تیار ہوئے، وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ جب کہ زویا خان نے بھی آج، اسی کی مناسبت سے بلیک کریپ کے نفیس سے کام والے سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔ شو لڈر کٹ ریشمی بالوں اور مناسب سے میک اپ کے ساتھ، وہ ہر نگاہ میں بے حد بچ رہی تھی، دیکھنے والوں نے اسے شانزل کے سنگ سنگ دیکھ کر کافی سراہا تھا۔
 ”دونوں اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں، بے حد مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ جب کہ سحرش کی سہیلیوں اور ان کی کزنز نے ڈھولک سنبھال کر محفل میں خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جھوم میں بھی، شانزل علی شاہ کی بھٹکتی ہوئی بے تاب نگاہ نے، بے ساختہ اسے ڈھونڈا تھا آخر وہ اسے مہمانوں کے بیچ سر جھکائے، قطعی خاموشی کے ساتھ بیٹھی دیکھائی دے گئی۔ صرف ایک لمحہ لگا تھا دل کی حالت بدلنے میں اور وہ حقیقتاً سرور ہوا تھا۔
 زویا خان نے بڑے چپکے سے اس کی یہ چوری پکڑی تھی اور بے ساختہ اس کے دل میں دور تلک سناٹوں کا قافلہ اتر آیا تھا تاہم پھر بھی اس نے کمال ضبط کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے، خوش دلی سے آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہا تھا۔ ہر طرف خوشیاں تھیں، تقہبے تھے مگر شانزل علی شاہ، سب سے بے نیاز ہو کر، ایک ٹک سببیں الہدی کے، سادہ سے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا تھا، جہاں کسی مسکراہٹ کا قطعی کوئی گزر نہیں تھا۔
 ڈارک بلوکر کے سادہ سے سوٹ میں بھی، وہ اسے دنیا کی سب سے حسین لڑکی

میں شریک سبھی مہمانوں نے، اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ مارے ندامت اور خوشی کے، خود سحرش کا حال دیکھنے والا تھا۔ اس نے جو گھٹیا قدم اٹھایا تھا اس کے بعد وہ اتنے خوبصورت انعام اور خوشیوں کی قطعی مستحق نہیں تھی، مگر خدا کے کرم کے بعد، یہ اس کے بھائی کا بڑا پن تھا کہ اس نے واقعی دل سے اس کی ہر خطا کو معاف کر دیا تھا۔

زویا خان بھی شانزل کے اس فیصلے پر بے حد مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ خود اس کے گھر والے آج کل اس پر شادی کے لئے دباؤ بڑھا رہے تھے، مگر وہ شانزل کی طرف سے پرپوزل کی منتظر تھی، تبھی تو مختلف بہانے بنا کر تاحال انہیں ٹالتی جا رہی تھی۔ سحرش اور ذیشان دونوں ہی اپنی نسبت بندھ جانے پر بے حد مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی شانزل نے تھوڑی سی سوچ و بچار کے بعد، زویا خان سے مشورہ کر کے، ان کی جلد شادی کے دن بھی طے کر دیئے۔ دونوں گھرانوں میں ایک دم سے جیسے خوشی کے شادیانے بج اٹھے تھے۔ ذیشان کی شادی کے لئے اگر سببیں سرگرم تھیں، تو ادھر زویا خان بھی اپنا خلوص، پوری ایمانداری کے ساتھ نبھا رہی تھی۔ شانزل اس کے احساسوں کا جتنا شکر یہ ادا کرتا کم تھا۔

اس روز بھی تپتی دھوپ میں پسینہ پسینہ ہو کر، وہ دونوں سحرش کو ساتھ لے کر چیلری پسند کرنے آئے تھے۔ جب اچانک شانزل کی نگاہ، سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی، پریشان حال سببیں الہدیٰ پر جا پڑی۔ ایک دم سے ہی اس کی غلافی آنکھوں میں خوشی کی جوت بڑھی اور اگلے ہی پل اس نے عین سببیں الہدیٰ کے قریب گاڑی روک دی۔ زویا خان اور سحرش نے پہلے تو یوں اس کے اچانک بریک لگانے پر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا، پھر سحرش کی نگاہ گاڑی کے قریب کھڑی۔ پسینے سے بے حال، سببیں الہدیٰ پر پڑی تو وہ سرعت سے گاڑی سے باہر نکل آئی۔

”ہیلو سببیں۔۔۔۔۔ آپ یہاں کیسے۔۔۔۔۔“ سببیں سے باقاعدہ مصافحے کے بعد سحرش نے پوچھا تھا، جب وہ دوپٹے کے پلو سے چہرے پر بہتا ہوا پسینہ صاف کر کے مدہم لہجے میں بولی۔
 ”وہ۔۔۔۔۔ میں اپنے ہزبینڈ کے ساتھ یہاں آئی تھی، وہ مجھے مارکیٹ میں ڈراپ کر کے، بچوں کو سکول سے لینے چلے گئے، م۔۔۔۔۔ میں انہی کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔“ شانزل گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی، اس کی اداس نگاہوں میں تیرتا ہوا کرب بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ مگر وہ خاموش تھا۔

”پلیز آئیں نا، ہم آپ کو، ڈراپ کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔“ سحرش نے بڑے خلوص سے

دل میرا ڈوب ڈوب جاتا ہے
میرے خوابوں میں اور خیالوں میں
عکس تیرا ہی جھلکتا ہے
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن.....
میری سوچوں میں، سب خیالوں میں
ساری باتوں میں سب خوابوں میں
ذکر تیرا ہی جاری رہتا ہے
اس تشنہ روح پہ طاری رہتا ہے
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن.....

سبعین الہدی..... اپنا چہرہ دھونے کے لئے واش بین کی طرف آئی تو وہ بھی سب
سے نگاہ بچا کر چپکے سے اُس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ سبعین اپنے پیچھے اُس کی آمد سے باخبر نہیں
تھی، لہذا سر سے دوپٹہ ہٹا کر، دونوں بازوؤں کو فولد کرتے ہوئے وہ چہرے پر صابن مسلنے لگی۔
مگر اُس کے پیچھے کھڑے شازنزل علی شاہ نے جو اُس کی نازک سی گوری کلائیوں پر تازہ زخموں
کے نشان دیکھے تو..... تڑپ کر آگے بڑھ آیا۔
”یہ..... یہ زخم کیسے لگے تمہیں؟“

لیک کر سبعین کا بازو پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ ہڑبڑا کر اس سے
اپنا بازو چھڑاتے ہوئے۔ سر پر دوپٹہ جما کر قطعی درشتگی کے ساتھ بولی۔

”تم کون ہوتے ہو یہ پوچھنے والے؟ ویسے بھی تمہارا بویا ہی تو کاٹ رہی ہوں میں.....“
”لیس، آئی نو، لیکن اپنے کینے کی تلائی بھی تو کرنا چاہتا تھا میں، مگر تم نے مجھے اس کا
موقع نہیں دیا۔“

”سو وہاٹ مسٹر شازنزل علی شاہ صاحب! میں نے کبھی آپ سے، یا کسی سے بھی کوئی
شکایت نہیں کی، میں اپنے نصیب کا لکھا، بھگت رہی ہوں۔ پلیز مت آیا کریں میرے سامنے،
آپ کو سامنے دیکھ کر، پھر سے گھاؤ رسنے لگتے ہیں میرے.....“ ادھر ادھر دیکھ کر نگاہیں چراتے
ہوئے وہ قدرے عاجزی سے بولی تھی۔ جب وہ دونوں بازو سینے پر پلیٹ کر، سر آدھ بھرتے
ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔

”آئی ایم سوری سبعین، آئی ایم رینلی ویری سوری، کاش، کاش میں تمہیں اپنا دل

دکھائی دے رہی تھی، عورتوں کے گھیراؤ میں کسی میچلی لڑکی کی بات پر صرف ایک لمحے کے لئے
زیر لب دھیمے سے مسکرائے تھے اور شازنزل علی شاہ کو ایسا محسوس ہوا تھا گویا اس کے دل میں دور
تک کلیاں سی چمک گئی ہوں۔ وہ قدرے فاصلے پر بیٹھوں کے قریب کھڑا، دونوں بازو سینے پر
باندھے، بڑی دل چسپ نگاہوں سے سبعین کو حشر کے ہاتھ پر مہندی رکھتے ہوئے دیکھ رہا
تھا۔ جب اس کی نگاہوں کی سمت پا کر، بے مقصد ہی زویا خان نے تھوڑی سی مہندی اٹھا کر،
چپکے سے، مدہوش کھڑے شازنزل علی شاہ کے شفاف چہرے پر لگا دی، زویا کی اس حرکت پر،
بری طرح چوکتے ہوئے، شازنزل نے اپنا معمولی سا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر وہ
اس میں بری طرح ناکام رہا تھا۔

جس پر تقریباً کبھی حاضرین محفل نے بلند و بالا تہقہ لگا کر، اپنی اپنی انجوائے منٹ کا
اظہار کیا تھا، کچھ منچلے لڑکوں نے تو باقاعدہ سیٹیاں بجا کر اس کا ریکاؤڈ لگایا تھا۔ تب اپنی خفت
مٹانے کے لئے، اس نے بھی سرعت سے لپک کر قریب کھڑی ایک لڑکی کی پلیٹ سے تھوڑی سی
مہندی اٹھائی اور زویا خان کی طرف پلٹا، مگر وہ بھلا اس کے ہاتھ آنے والی کہاں تھی، سب لوگ
اسے بے حد انجوائے کر رہے تھے، خود سبعین کی نگاہیں بھی مسلسل دونوں پر جمی ہوئی تھیں، کہ
اچانک زویا خان بھاگ کر سبعین کی طرف چلی آئی اور شازنزل کے ہاتھ میں موجود، مہندی قطعی
اتفاق کے ساتھ، زویا خان کی بجائے، سبعین الہدی کے گال پر اپنے دیدہ زیب نقش نگار بنا
گئی۔ لوگ ہنس رہے تھے، ان کی سرگرمیوں کو انجوائے کر رہے تھے، مگر وہ اک دم سے پتھر کا
مجسمہ بنا، اس لڑکی کے سامنے کھڑا تھا کہ جس کی نگاہوں میں، اس وقت بھی، سوائے کریناک
سناٹوں کے، اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی جب پاس تم نہیں ہوتیں.....

خود کو کتنا اُداس پاتا ہوں

جانے کیا دھن سامی رہتی ہے

خاموشی دل پہ چھائی رہتی ہے

دل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی

میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن.....

پھر بھی جب تم اُداس ہوتی ہو

اب تو ان عذابوں سے بچ کر بھی نکلنے کا راستہ نہیں جانا
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال لمحوں سے، واسطہ نہیں تھا جانا
ہم نے سوچ رکھا ہے

چاہے کچھ بھی ہو جائے، تم سے کچھ نہیں کہنا

سحرش اور ذیشان، مستقل طور پر ناروے شفٹ ہو گئے تھے، کیونکہ ذیشان سحرش کو اپنی
چچیوں کے عتاب کا شکار بننا نہیں دیکھ سکتا تھا، لہذا اپنی تمام پراپرٹی کا مسئلہ کلیئر کر کے اپنا بزنس
ناروے سیٹل کرنے کے بعد وہ سبوعین کے باقاعدہ فورس کرنے پر ہمیشہ کیلئے ناروے شفٹ ہو گیا۔
شانزل علی شاہ کی اس روز سبوعین کے شو ہر فیصل شہزاد احمر سے میٹنگ تھی، سودہ مکمل
تیاری کے ساتھ زویا خان کو ساتھ لے کر ”احمر ولاج“ میں منعقد چھوٹی سی پارٹی کی تقریب میں
شرکت کے لئے چلا آیا۔ فیصل شہزاد احمر سے یہ اس کی پہلی کوئی باقاعدہ بزنس ڈیلنگ تھی وگرنہ
اس سے قبل وہ لوگ اکثر اوقات اپنی اپنی کمپنیوں کے چیف کی حیثیت سے مشترکہ پارٹیوں کی
میٹنگز میں شریک ہوتے رہے تھے۔

پھر جس وقت وہ لوگ ”احمر ولاج“ پہنچے پارٹی تقریباً شروع ہو چکی تھی۔ فیصل شہزاد
احمر نے آج آف وائٹ کمر کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا جب کہ سبوعین اسے شیفو کی خوبصورت
پر پل کلر کی ساڑھی میں ملبوس دکھائی دی تھی، ہلکے پھلکے سے میک اپ کے ساتھ خود سے قطعی بے
نیاز بنی وہ آنے والے تقریباً ہر مہمان کو کوئلڈ ڈرنک سرو کر رہی تھی۔ شانزل علی شاہ نے جو اسے یہ
”ڈیوٹی“ سرانجام دیتے دیکھا تو شدید دکھ سے زمین پر گر پڑا۔

دوسرے مہمانوں سے فارغ ہو کر وہ شانزل علی شاہ اور زویا کے لئے مشروب لے
کر آئی تو اس کی بھی ہوئی اداس نگاہوں میں حد درجہ تکلیف کے آثار نمایاں تھے جانے کن
حواسوں میں گم اس نے گلاس تھانے کے لئے جو نبی نگاہ جھکائی سبوعین کے نرم و نازک دایلیں
ہاتھ پر بنے بڑے بڑے آبلے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

سبوعین نے حتی المقدور اپنے زخم چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مگر شانزل علی شاہ کی
نگاہوں سے یہ زخم پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔ کس قدر تڑپ کر گلاس تھامتے ہوئے اس
سبوعین کی طرف نگاہ کی تھی، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اب زویا خان کو گلاس تھام
ہوئے اس سے حال احوال دریافت کر رہی تھی۔ پل دوپل کے لئے زویا خان کو گلاس تھام
ہوئے زویا خان کا ہی نگلن لگنے سے اس کے ہاتھ پر بنے آبلے کو تکلیف پہنچی تھی۔ جس سے

چیر کر دکھا سکتا کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ تمہاری آنکھوں کو آنسوؤں کے سپرد کرنے کی پاداش
میں، میں خود اپنی آنکھوں کی نیندیں گنوا چکا ہوں، پلیز مجھے معاف کر دو سبوعین، خدا کے لئے
مجھے اس سزا سے بری کر دو، پلیز.....“

دونوں ہونٹ بھیج کر نہایت بے بسی کے انداز میں اس نے کہا تھا، کہ اسی پل زویا
خان وہاں چلی آئی، زویا خان کو دیکھ کر سبوعین نے سرعت سے اپنا رخ بدلا تھا، پھر چہرے کو
اچھی طرح صابن سے دھو کر، فوراً وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔

”کیوں بنی کچھ بات؟“

سبوعین کے وہاں سے رخصت ہوتے ہی زویا خان نے ڈائریکٹ شانزل علی شاہ کو
مخاطب کیا تھا، مگر وہ اس کے سوال کا، کوئی جواب دیئے بنا تیزی سے منہ دھو کر خود بھی وہاں سے
فوراً نکل گیا۔

☆☆☆

ہم نے سوچ رکھا ہے

چاہے دل کی ہر خواہش

زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کر بہہ جائے

چاہے اب مکینوں پر گھر کی ساری دیواریں

چھت سمیت گر جائیں

اور بے مقصد ہم، اس بدن کے بلے میں

خود ہی کیوں نہ دب جائیں

تم سے کچھ نہیں کہنا

کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے

اور اب گلابوں پر، نیند والی، آنکھوں پر

نرم خوسے خوابوں پر

کیوں عذاب ٹوٹے ہیں تم سے کچھ نہیں کہنا

گھر گئے ہیں باتوں میں، بے لباس باتوں میں

اس طرح کی راتوں میں

کب چراغ جلتے ہیں، کب عذاب ٹلتے ہیں

گلاس پر اس کی گرفت مضبوط نہ رہ سکی اور سارا مشروب زویا خان کے نفیس کپڑوں پر آگرا کپکپاتے ہونٹوں سے سہم کر فیصل شہزاد احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوری کی تھی، مگر وہ آل ریڈی اس طرف متوجہ ہونے کے باعث فوراً ہی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”تزاخ..... یوسٹوپڈ ویمین تمہیں مہمانوں کو صحیح طرح سے ڈیل کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔“

سرخ انگارہ آنکھوں سے اس کے من موہنے چہرے کو گھورتے ہوئے اس نے ایک زوردار تھپڑ سبیین الہدی کے شفاف گال پر لگایا تو شانزل کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ چلائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”کنٹرول یور سیلف مسٹر فیصل شہزاد احمد صاحب یہ مشروب زویا خان کی غلطی سے گرا ہے سبیین صاحبہ کی غلطی سے نہیں۔“

”سو وہاٹ مسٹر شانزل یہ پھوہڑ عورت کسی کام کا سلیقہ نہیں رکھتی، آئی ایم سوری مس زویا خان، آپ کو میری جاہل واقف کی وجہ سے اس کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔“

محفل میں شریک مہمانوں کی پروا کیے بغیر وہ سبیین کو پرے دھکیلتے ہوئے زویا خان کی طرف متوجہ ہوا تو شانزل کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ لپک کر اس نے لڑکھرائی ہوئی سبیین الہدی کو تھام کر گرنے سے بچایا تھا۔ آنسوؤں سے لبالب بھری جھلملاتی نگاہوں میں اس قدر تذلیل پر درد چھلک آیا تھا۔ جب کہ خود شانزل کی نگاہوں میں جیسے اس کے دل کا سارا خون سمٹ آیا تھا۔ ضبط سے سرخ درد سے نڈھال نگاہیں اس کے ستے ہوئے چہرے پر جمائے وہ گویا پل میں ڈھے گیا تھا۔

ہجر کے ماہتاب سن، ہم بھی تیرے ہم سفر ہم سے بھی کوئی بات کر
ہم تو تیرے رفیق ہیں، ہم سے نہ اجتناب کر
دشہ فراق یار میں، ازلوں کے ہم رکاب سن
ہجر کے ماہتاب سن
بخت میں جب نہ چین ہو، وقت سے کیا گلہ کریں
اس سے کہاں ملا کریں.....؟
راہ میں اس کو روک لیں، کیسے یہ حوصلہ کریں
تو تو ہمارے ساتھ چل، تو تو ہمارے خواب سن

ہجر کے ماہتاب سن
تاروں میں انتشار ہے، کس کی نگاہ کے سبب
ہم نے جسے گنوا دیا، شدت راہ کے سبب
اس کے غم فراق میں، ہم سے کبھی حساب سن
ہجر کے ماہتاب سن

اس کی توقع کے عین مطابق زخم زخم سی سبیین الہدی نے نہایت درشتی کے ساتھ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے نفرت بھری ایک نگاہ اس کی کرب چھلکاتی نگاہوں پر ڈالی اور اگلے ہی پل خود کو سنبھالتے ہوئے اندر کہیں کسی کمرے میں گم ہو گئی۔ کوئی اس وقت شانزل علی شاہ اس کے دل کا حال پوچھتا، کہ وہ کیسے لہو لہو ہو کر رس رہا تھا، کس قدر کرب کے عالم میں اپنی بیگلی پلکیں پونچھتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا، فیصل شہزاد احمد سے کوئی بھی ڈیل طے کئے بغیر ہال سے نکل کر طویل راہداری کی طرف آیا تو قریب ہی کسی کمرے سے سبیین کو روتے ہوئے سن کر ٹھٹھک گیا۔

”مما..... پایا نے کل بھی آپ کو مارا تھا ناں، پایا بہت گندے ہیں، آئی ہیٹ ہم.....“

سبیین کی کھٹی کھٹی سی سسکیوں کے ساتھ ہی کسی معصوم سے بچے کی آواز سنائی دی تھی، تبھی جیسے وہ بکھر کر رہ گیا۔ آج پھر سبیین کو اس کی وجہ سے تکلیف پہنچی تھی، مگر آج اس نے خود کو انتہائی بے بس پایا تھا۔ وہ اس سے بے انتہا نفرت کرتی تھی، اس قدر شدید نفرت کہ جب بھی اتفاق سے اس کی نگاہ شانزل کے غور و چہرے کی طرف اٹھتی تو اس کی شفاف نگاہوں سے نکلنے والی غصے کی چنگاریاں اسے پل میں جلا کر خاکستر کر دیا کرتی تھیں۔

”یا میرے خدا..... مجھے بتا، کہ میں اس بے ضرری لڑکی کے دکھ کیسے بانٹوں؟ کیسے اس کے ایک ایک آنسو کو اپنے ہونٹوں سے چن کر اس کے سارے درد اپنے سینے میں اتار لوں کیا کروں میں.....“

شدید اضطراب کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کے بال جکڑتے ہوئے بے بسی سے اس نے سوچا تھا اور اگلے ہی پل وہاں سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے احمد ولاح سے باہر نکل گیا۔ اگلے بہت سے دن بھی اس کے شدید بے قراری کی نذر ہو گئے تھے جب بھی آنکھیں موندتا چہم سے کسی کی آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں تصور میں چلی آتیں اور وہ بچل کر رہ جاتا ذیشان تا حال اس کی عبرت انگیز زندگی سے بے خبر تھا، کیونکہ وہ اس کے سامنے اتنی

ہوشیاری سے خوش ہونے کی ایک ننگ کرتی کہ وہ کبھی اس کے اصل حال تک پہنچ ہی نہ پایا تھا، مگر شانزل علی شاہ اس پر گزرنے والے عذابوں سے کسی طور پر بے خبر نہیں تھا، تبھی اس روز وہ اسے مارکیٹ میں ملی، تو وہ بڑے دھڑلے سے اس کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

جب دور کہیں پر بت سے پرے

مغموم فضا میں دیپ جلے

دل سوچتا ہے

جب راکھ بہتی یاروں کی

اور رات کا دامن بھگ چلے، دل سوچتا ہے

جب ہجوری سے مجبوری ہو

کوئی بھی آس نہ پوری ہو، اور حد نظر تک دوری ہو

پھر رفتہ رفتہ شام ڈھلے، دل سوچتا ہے

جب کچھ بھی اپنے بس میں نہیں، یہ پاگل من کیوں سوچتا ہے

کیا کھوجتا ہے؟

خوبصورت غلٹی پلکیں موندے وہ سارے جہان سے بے خبر گہری نیند میں تھا جب اداس سی انزلہ شاہ نے اس کی چار پائی کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ موٹی موٹی بند غلافی آنکھیں مغرورتا ہوا تیکھناک، کشادہ پیشانی پر بکھرے سیاہ ریشمی بال، مضبوط چوڑے کندھے، بھاری مونچھوں تلے دبے گداز ہونٹ، وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کے بعد سراہا جاتا جانے وہ کیا حالات تھے، وہ ایسی کون سی مجبوریاں تھیں کہ جس نے اس کو برو سے سلجھے ہوئے انسان کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔

گہری نیند میں سوئے ہوئے وہ اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ انزلہ شاہ چاہنے کے باوجود بھی خود کو اس کی پیشانی پر بکھرے سلکی بال سینے سے روک نہیں پائی تھی اور شاید یہ اس کی گداز انگلیوں کے لمس کا ہی اثر تھا کہ بے خبر سوچتے سمعان علی شاہ نے پٹ سے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر، خاصی حیرانگی سے اس کی وہاں موجودگی کو دیکھا تھا۔

”السلام علیکم..... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

اس کے اچانک بیدار ہونے پر بناء ہچکچائے وہ قدرے دوستانہ سی مسکراہٹ اپنے

عنائی لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی، تو سمعان علی شاہ کے بے خبر حواس کو مزید دھچکا لگا۔ کبھی تو وہ اس سے اس قدر نفرت کرتی تھی کہ اس کی جان تک لینے کے درپے ہو گئی تھی اور کہاں اب یوں اس قدر دوستانہ انداز میں اس سے اس کا حال پوچھا جا رہا تھا۔

”آئی ایم سوری سمعان..... میں اپنی گذشتہ حرکت پر، آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔“

اسے خاموشی سے دوبارہ پلکیں موندتے دیکھ کر اس نے پھر کہا تھا جب وہ اپنی خور

نگاہیں باقاعدہ اس کے چہرے پر جماتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”شرمندگی تو میں تم سے محسوس کر رہا ہوں انزلہ، زندگی میں پہلی بار تم نے مجھ سے

کوئی چیز مانگی اور وہ بھی میں تمہیں نہ دے سکا۔“

”نہیں..... پلیز مجھے اور شرمندہ مت کرو سمعان میں جان گئی ہوں کہ تم ان راستوں

پر زبردتی دھکیلے گئے ہو، مگر میں تمہیں اب مزید ان راستوں پر گامزن رہنے نہیں دوں گی۔“

وہ تڑپ ہی تو گئی تھی اس کے الفاظ پر مگر سمعان کے لبوں پر اس کے الفاظ نے ایک

پھسکی سی طنزیہ مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”تم یہاں سے شہر واپس چلی جاؤ انزلہ، یہاں کا ماحول تمہارے لئے سازگار

نہیں ہے۔“ انزلہ سے نگاہیں ہٹا کر بستر سے اترتے ہوئے اس نے کہا تھا جب وہ سرعت سے

اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”میں یہاں کے ماحول کو اپنے لئے سازگار بنا لوں گی۔“

میرے حوالے کر دو۔“

”پاگل پن کی باتیں مت کرو لڑکی، بہت برا آدمی ہوں میں، کچھ نہیں جانتی ہوں تم

میری عادتوں کے بارے میں۔“ اسے سامنے ہٹا کر وہ قطعی درستی کے انداز میں بولا تھا جب وہ

چلتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

”جاننا ہی تو چاہتی ہوں میں تمہارے بارے میں، پھر کیوں بھاگ رہے ہو تم مجھ سے؟“

”کیوں تم حماقت کرنے جا رہی ہو فضول میں اپنا ٹائم ضائع مت کرو، میں

سدھرنے والا آدمی نہیں ہوں۔“ قطعی لا پرواہی کے انداز میں کہتے ہوئے وہ کمرے کی دہلیز

عبور کر گیا تو انزلہ محض سلگ کر رہ گئی۔ اسے گاؤں آئے ہوئے پورے دو ماہ ہو گئے تھے، مگر ان

دو ماہ میں وہ سوائے ساجد حسین کے گھر والوں کے اور کسی سے بھی واقفیت پیدا نہیں کر سکی تھی،

گھر میں ہر وقت قید رہنا، اس کی بے چین طبیعت کو گوارہ نہیں تھا، سودا دی ماں کے منع کرنے

راستے میں خاصی پھسلن تھی، کچے راستوں پر بارش کا پانی ٹھہر جانے کے باعث اسے چلنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ آج سے قبل یوں بھیکے ہوئے کچے راستوں پر چلنے کا اسے کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پاؤں میں سادہ چپل تھی، مگر پھر بھی وہ کئی جگہوں پر پھسلنے پھسلنے پچی تھی۔ خدا خدا کر کے اس نے اپنے گھر سے سعان علی شاہد کے ڈیرے تک کا راستہ طے کیا تھا، مگر وائے نصیب کہ اس کے ڈیرے پر پہنچ کر اچانک اسے اپنے سامنے سے آتے ہوئے دیکھ کر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اگلے ہی پل پکڑوں والی پلیٹ سمیت دھڑام سے زمین پر آگری۔ سعان جو ابھی ابھی اپنے پورشن سے خاصے متفکر چہرے کے ساتھ باہر نکلا تھا اسے یوں عین نگاہوں کے سامنے دھڑام سے زمین بوس ہوتے دیکھ کر کھلکھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ انزلہ نے جو اپنے حال پر اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو فوراً خشکی سے تیوری چڑھائی۔

”شرم کرو کچھ..... بجائے اس کے کہ تم لپک کر مجھے گرنے سے بچاتے الٹا میرے گرنے پر کھڑے ہنس رہے ہو۔“

”بالکل پہلی بار کسی بندریا کو یوں زمین چاٹتے دیکھا ہے، ہنسی تو آئے گی ناں.....“

کشادہ سینے پر دونوں بازو باندھے اس نے خاصی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مزید چڑٹی۔

”کیا..... کیا..... تم نے مجھے بندریا کہا، ارے بندر ہو گے تم خود تمہاری آنے والی ساری نسلیں آئے بڑے کہیں سے انجوائے کرنے والے، میں ہی پاگل تھی جو اتنے بھیکے موسم میں دادی ماں کو بتائے بغیر، تمہارے لئے چٹ پٹا پکوان لئے چلی آئی۔“

کہنیوں کے بل خود ہی ہمت کر کے اٹھتے ہوئے اس نے منہ بسور کر کہا۔ تو قدرے فاصلے پر کھڑا سعان ہنستے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

”سوری..... اصل میں تمہارے زمین بوس ہونے کا منظر اس قدر دلفریب تھا کہ میں چاہ کر بھی خود کو ہنسنے سے روک نہیں پایا خیر شکریہ بہت بہت میرے لئے اتنی زحمت اٹھانے کی۔“

”بس..... رہنے دو یہ تکلفات..... بڑی ماں کیسی ہیں.....؟“

ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روکتی ہوئی وہ کپڑے جھاڑ کر آگے بڑھ آئی تو ناچار سعان کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ اندر بڑی ماں تیز بخار میں جل رہی تھیں۔ انزلہ کو خبر ہوئی تو اسے اپنی لاپرواہی پر حد درجہ ندامت ہوئی۔

”اب کیسی ہیں بڑی ماں؟“

کے باوجود وہ تقریباً ہر روز اس سے ملنے کے لئے چلی آتی تھی، مگر یہ شخص نجائے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ پاؤں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔ اس کے زخم ابھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس نے اپنی سرگرمیاں اسی انداز میں پھر سے شروع کر دی تھیں۔ وہی اس کا لوفرانہ۔ جھگڑا لوانداز وہی گاؤں والوں کو پریشان کرنا وہی آتی جاتی سیدھی سادی لڑکیوں کو چھیڑ کر لطف سمیٹنا اور وہی آس پاس کے گاؤں کے وڈھیروں کے ساتھ بات بے بات دنگا فساد کرنا انزلہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے ہدایت کے راستے پر لائے۔ کیونکہ اس کی اچھی باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

پھر انزلہ کو بھی اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ ہرگز اس کے ڈیرے پر نہ آیا کرے، مگر انزلہ چونکہ اسے سدھارنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ سو اس نے سعان کی سخت ہدایت ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے باہر نکال دی اس روز موسم بہت پیارا تھا۔ عصر کا وقت ڈھل رہا تھا آسمان پر پھیلے سیاہ گھنگھور بادلوں نے ٹھنڈی معطر ہواؤں کو خوشبو لٹانے کی مکمل اجازت دے رکھی تھی ارد گرد لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف دکھائی دے رہے تھے، کوئی ہرے بھرے کھیتوں میں مصروف عمل تھا تو کوئی آنے والی متوقع بارش کے پیش نظر اپنے اپنے جانوروں کو محفوظ جگہ پر باندھنے میں ہلکان ہو رہا تھا۔ لڑکے بالے ٹولیوں کی صورت میں اکٹھے ہو کر خوب شور و غل مچا رہے تھے، جب کہ نوجوان لڑکیوں نے دیگر کام سمیٹ کر، وقت سے قبل ہی چولہے سنبھال لئے تھے۔

زندگی کا اصل لطف اس نے یہاں دیکھا تھا۔ جہاں کسی کے پاس فضول میں سر پر ٹینشن سوار کرنے کے لئے کوئی ٹائم نہیں تھا۔ کچے گھروں سے اٹھتی، حلوے اور مختلف میوہ جات کی خوشبوئیں اس کا من لپکا رہی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی ہلکی بوند باندی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ دادی ماں صبح سے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ لہذا اس وقت ان کے پاس محلے سے رشید چاچا کی بیگم آ کر بیٹھیں تو انزلہ نے زبردستی انہیں بستر پر رضائی میں بٹھا کر، صحن کا سارا اچھیلا ہوا کام خود سمیٹ لیا۔ ٹپ ٹپ برستی ننھی ننھی بارش کی بوندوں میں ادھر ادھر چل پھر کر چھوٹے چھوٹے کام کرنا، اس وقت کتنا بھلا لگ رہا تھا اسے..... تبھی آس پاس کے گھروں سے اٹھتی دلفریب خوشبوؤں سے متاثر ہو کر، اس نے خود بھی چٹ پٹے پکڑے بنائے اور ایک پلیٹ دادی ماں کے ساتھ رشید چاچا کی بیگم کو تھمانے کے بعد، وہ چپکے سے ایک پلیٹ میں کچھ پکڑے رکھ کر سعان علی کے ڈیرے کی طرف چل پڑی۔

”غضب خدا کا یا ر..... تم ایک لڑکی ہو یا کوئی تھا نے دارنی، رعب تو ایسے ڈال رہی ہو جیسے میں نے تمہارا خزانہ دبا رکھا ہے۔“

”چپ چاپ کھانا کھاؤ..... کم از کم آج کے دن میرے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔“

پٹ سے جواب دے کر، اس نے جلتے ہوئے چولہے پر دلیہ رکھ دیا۔

”بڑی ماں..... آپ نے کوئی دوا وغیرہ بھی لی ہے یا نہیں؟“

سعدان کو کچھ بھی کہنے کا موقع دے بغیر وہ فوراً بڑی ماں کی چارپائی کے قریب چلی آئی،

پھر ان کے اثبات میں سر ہلانے پر، اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ کر بخار چیک کرتے ہوئے بولی۔

”بخار تو اب بھی ہے، مگر آپ فکر نہ کریں۔ اب میں آگئی ہوں ناں بخاریوں بھاگ

جائے گا آپ کا.....“ چٹکی بجاتے ہوئے اس نے کہا تھا، جب سعدان اس کی بات سن کر

مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... بھلا مستقل دردِ سر کے سامنے، بچارے بخار کی کیا دلیو؟“

”تم چپ رہو اچھا“

”او کے بڑی ماں..... اب میں چلتی ہوں، دادی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

جھک کر بڑی ماں سے پیار لیتے ہوئے اس نے رخصت چاہی، تو سعدان بھی

کھانے سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو..... میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں..... آپ یہیں رہیں بڑی ماں کے پاس، دلیہ میں نے پکنے کے لئے رکھ دیا

ہے، کچھ دیر میں پک جائے گا تو بڑی ماں کو ڈال کر دیجئے گا، پتہ نہیں دو دن سے انہوں نے بھی

کچھ کھایا ہو گا یا نہیں؟ آپ تو اپنے لئے نہیں بنا سکے، ان کا کہاں خیال رکھا ہو گا۔“ فوراً ہی

سہولت سے منع کرتے ہوئے اس نے چوٹ کی، تو وہ واقعی چڑ گیا۔

”اتنا ہی خیال ہے بڑی ماں کا، تو روز آ کر سنبھال جایا کرو، ویسے بھی تم مجھ سے

زیادہ ان کا خیال نہیں رکھ سکتیں۔“

”جانتی ہوں..... مگر تم نے خود ہی تو روز آنے سے منع کیا تھا۔“ فوراً منہ بسور کر صفائی

پیش کی تو وہ پھر سے مسکرا دیا۔

”میں تمہاری رسوائی نہیں چاہتا انزلہ..... یہاں میرے ڈیرے کا کوئی بھی شخص،

تمہیں میلی نگاہ سے دیکھے میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس کے لفظوں میں سو فیصد سچائی تھی، تبھی

چارپائی پر ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی ماں کا ہاتھ تھاما تو ایک شفیق سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹی لیکن سعدان نے پچھلے دو روز سے کچھ نہیں کھایا ہے مجھے تو ہوش

ہی نہیں تھا اور باہر کی چیز یہ کھاتا نہیں ہے۔ اگر تمہیں کوئی زحمت نہ ہو تو اسے کھانے کو کچھ بنا دو۔“

”نہیں ماں میں ٹھیک ہوں، بس آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔“ انزلہ کے کچھ

کہنے سے قبل ہی وہ بول اٹھا تھا، جس پر وہ اچھے خاصے غصے میں آ کر اس سے الجھ پڑی۔

”تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ ہاں.....؟ آسمان سے نہیں اترے ہو تم، جو میں

تمہاری چاکری کرتی پھروں گی، آئے بڑے کہیں کے نواب۔“

اس کے الفاظ پر نہ صرف وہ دھیسے سے مسکرایا تھا، بلکہ ایک بڑی خوشگوار سی مسکراہٹ

بڑی ماں کے لبوں پر بھی بکھر گئی تھی۔

نخرے تو ایسے کرتے ہو جیسے میں دل و جان سے مرٹی ہوں ان پر، ہونہہ.....

میرے لئے تم جیسا پتھر دل ہی رہ گیا ہے؟“

رسوائی سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر آٹا اور دیگر سامان نکالتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی

اور سعدان کن اکھیوں سے بڑی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے دل سے مسکرا رہا تھا آج سے قبل

بھلا کہاں کسی نے اس کی اتنی پرواہ کی تھی۔ آج بہت عرصے کے بعد اس کے لبوں پر حقیقی

مسکراہٹ کی آمد ہوئی تھی۔ تبھی وہ بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

”چلو..... اب وہاں بیٹھے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو..... یہاں آ کر آگ جلانے میں

میری مدد کرو۔“

لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بے ترتیبی سے چولہے میں ٹھونٹتے ہوئے وہ

ہلکے ہلکے دھوئیں میں کھانسی ہوئے بولی تو سعدان بڑی ماں کی ہدایت پر، ان کی چارپائی سے

اٹھ کر آگ جلانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

لکڑی کی پیڑھی پر پھیل کر بیٹھی ہوئی وہ دونوں ہاتھوں سے روٹی بیلتی لکتی پیاری

دکھائی دے رہی تھی، سعدان بے ساختہ ہی سامنے بیٹھ کر یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

”او ہیلو..... میاں مجنوں صاحب..... روٹی بن گئی ہے، کھا لیں.....“

روٹی اور آلیٹ اکٹھے بنا کر، اس کے سامنے رکھنے کے بعد وہ پھر قدرے رعب

سے بولی تو سعدان چپ نہ رہ سکا۔

وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”برداشت نہیں کر سکتے تو سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتے.....؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم بھی کھل کر جیو، تمہارا بھی ایک پیارا سا گھر ہو، جہاں.....“

”بس..... اب جاؤ تم یہاں سے، تمہاری دادی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

پل میں اس کے چہرے اور آنکھوں کا رنگ بدلا تھا، ابھی وہ اداس نگاہوں سے، اس پر آخری الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے واپسی کے لئے پلٹ آئی جب کہ مضطرب کھڑا، سعاد علی شاہد، وہیں اپنے ڈیرے سے باہر کھڑا دور تک اداس نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا نجانے کیوں ہر بار یہ لڑکی دل میں ایک نئی ٹیس کو پیچھڑ کر چلی جاتی تھی۔

کتنے ہی دن بیت گئے تھے۔ بڑی ماں کی طبیعت بھی کافی سنبھل گئی تھی۔ مگر وہ اس روز کے بعد اسے دکھائی نہیں دی، نجانے کس وقت اس کی غیر موجودگی میں وہ چپکے سے آتی اور بڑی ماں کو کھانے پلانے کے علاوہ، دواء دے کر، سعاد کے لئے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر، اس کی ہر چیز کو سلیقے سے سنبھال کر اس کی جگہ پر رکھ جاتی تھی، پچھلے دو ہفتوں سے اس کے کپڑے بھی انزلہ ہی دھو کر پریس کر رہی تھی، مگر اسے خبر تک نہ ہو پائی تھی دل میں اسے دیکھے بغیر عجیب سی بے کلی کا راج ہو گیا تھا، مگر اس نے ہمیشہ کی طرح نہایت بے دردی سے دل کی آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔

گاؤں میں آج کل نیا ہی طوفان اٹھا تھا جس پر ہر شخص بدتمس تھا اڑتے اڑتے یہ خبر سعاد علی شاہد کے کانوں تک پہنچ گئی تھی کہ ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کا بیٹا، انزلہ شاہ کے خوبصورت سراپے پر مر مٹا ہے، لہذا اس نے انزلہ کو ہمیشہ کے لئے اپنے گھر کی زینت بنانے کا مسمم ارادہ کرتے ہوئے اس کی دادی اماں کو اپنا پرپوزل بھیج دیا ہے جس پر خاصی سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ خبر کیا تھی، کوئی بم تھا جو اسے عین اپنی سماعتوں کے قریب پھٹتا محسوس ہوا تھا، لاکھ وہ پچھلے دو ہفتوں سے اسے دیکھ نہیں پایا تھا، مگر وہ یوں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دشمنوں کے گھر کی زینت بن جائے، یہ بات دل کو کسی طور گوارہ نہیں تھی، تبھی وہ شدید اشتعال کے عالم میں جیسے پھر سے اپنے سارے حواس گنوا بیٹھا تھا، سرخ سرخ غلائی آنکھوں میں اس لمحے جیسے خون اتر آیا تھا۔

ڈیرے سے انزلہ کے گھر تک کا فاصلہ پل صراط ثابت ہوا تھا اس کے لئے تاہم اس کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہر طرح کی تمیز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زوردار ٹھوکے

ساتھ دروازہ کھولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اندر صحن میں چلا آیا۔ انزلہ اس وقت تل کے نیچے بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی، جب کہ دادی ماں دھلے ہوئے کپڑوں کو نچور نچوڑ کر تار پر پھیلا رہی تھیں۔

”یا اللہ خیر..... کسی کے گھر میں داخل ہونے کا یہ کون سا مہذب طریقہ ہے؟“

دادی اماں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی تھی، جب وہ کسی بھی تمیز سے بے نیاز غرا کر بولا۔

”میرے لئے اس گاؤں کے کسی بھی گھر میں داخل ہونے کا یہی طریقہ ہے، مگر آپ کان کھول کر سن لیں، اگر آپ لوگوں نے انزلہ کا رشتہ ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں کے ساتھ طے کیا، تو آپ کے لئے اچھا نہیں ہوگا..... سنا آپ نے؟“

غصے میں اس کی آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں، تبھی اپنے گیلے ہاتھوں کو ڈوڈپے سے خشک کرتی انزلہ شاہ اس کے قریب چلی آئی۔

”کیا کر لو گے تم.....؟ ہاں..... کیا بگاڑ لو گے میرا.....؟“ اس کے لہجے میں کس قدر سکون تھا، وہ محض غصے سے بل کھا کر ہی تورہ گیا۔

”اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں اور آگ لگا دوں گا تمہارے اس پورے گھر کو.....“

”ویل..... مسٹر سعاد علی شاہد، بٹ وائے.....؟ یہ میری زندگی ہے میں جیسے چاہوں گزاریں آپ بلا وجہ مجھے دھمکیاں دینے والے کون ہوتے ہیں؟“ روشن پیشانی پر پل دو پل کے لئے گہرے بل پڑے تھے جب وہ پھنکار کر بولا۔

”تم میری آنکھوں کے سامنے میرے دشمنوں کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی انزلہ یہ یاد رکھنا تم.....“

سرخ انگارہ آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر وارن کرنے والے انداز میں بولا اور اگلے ہی پل لے لے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا دادی ماں ابھی تک اس کے خطرناک روپ کی وجہ سے ہراساں کھڑی تھیں۔ تب انزلہ نے دھیمے سے سر جھٹک کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”ڈونٹ وری دادی ماں..... یقیناً اسے کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بہر حال خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مم..... میں اسی لئے منع کرتی ہوں کہ تو اس کے منہ نہ لگا کر وہاب دیکھ لیا ناں کتنے استحقاق سے دھمکا کر گیا ہے حالانکہ ابھی تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی اوپر سے تیرے دادا جی

ہاتھ میں ڈھیر سارے شاپنگ بیگ سنبھالے وہ تھکن سے بے حال ہو رہی تھی جب دھواں دھواں سی آنکھیں لئے وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
 ”کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

اپنائیت کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ تھامنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا، مگر سبب نے تنفر سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

”شکریہ..... مجھے آپ کی کوئی مدد نہیں چاہیے، راستہ چھوڑیں میرا۔“
 ”کیوں خود پر ظلم کر رہی ہو سببیں، مانا کہ مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، مگر اس کی سزا تم اپنے آپ کو کیوں دے رہی ہو۔“

وہ تڑپ ہی تو گیا تھا اس کے لہجے پر، مگر سببیں الہدیٰ نے مطلق اس کے الفاظ پر توجہ نہیں دی۔

”میرا راستہ چھوڑیں مسٹر شانزل رضا، وگرنہ میں چیخ چیخ کر سارے بازار کو یہیں اکٹھا کر لوں گی۔“

”کوئی پرواہ نہیں، تم چاہو تو خود اپنے ہاتھوں سے مجھے گولی مار دو سببیں، مگر پلیز خود کو اس جہنم سے نکال لو، وہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے، وحشی درندہ ہے وہ، اسے چھوڑ دو سببیں پلیز۔“

پھر سے غلافی آنکھوں میں التجاء سمیٹ کر بے بسی سے لب بھینچتے ہوئے اس نے کہا تھا جب وہ شدید غراتے ہوئے بولی۔

”شٹ اپ مسٹر شانزل علی صاحب..... مانیٹڈ پور لیگنوج میں اپنے شوہر کے خلاف آپ کی کوئی بکو اس نہیں سنوں گی۔“

”او کے..... مگر وہ اس لائق بھی تو ہو کہ اس کی تعریف کی جائے۔“ شانزل علی شاہ نے فوراً ہتھیار پھینک ڈالے تھے۔

”یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے مسٹر..... آپ کو زیادہ ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 انتہائی ترش لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم آگے بڑھادیئے تھے مگر

شانزل نے پھر سے اس کا راستہ بلاک کر دیا۔
 ”انکل پلیز، ہمیں جانے دیں، میرے پاپا گھر پہنچنے والے ہوں گے اگر ماما ان سے پہلے گھر نہ پہنچیں تو وہ ماما کو بہت ماریں گے پہلے ہی انہوں نے کل ماما کو بہت پیٹا تھا میں نے خود ماما کو زخموں پر دواء لگائی ہے۔ پلیز ہمیں جانے دیں۔“

بھی نہیں ہیں۔ مم..... میں اکیلی جان، بھلا کیا کروں گی اس کا؟“
 وہ واقعی بہت زیادہ سہم گئی تھیں۔ تب انزلہ کو اگلا بہت سا وقت انہیں مطمئن کرنے میں لگا۔ نجانے کیوں آج اپنے لئے سنعان کو اس قدر مشتعل دیکھ کر اسے بڑا قرار ملا تھا، مگر یہ قرار ٹھیک اگلے ہی دن اس وقت رخصت ہو گیا، جب اسے اطلاع ملی کہ سنعان علی شاہد کا ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں کے ساتھ زبردست جھگڑا ہو گیا ہے اس جھگڑے کے نتیجے میں، جہاں ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں کو خاصا نقصان پہنچا تھا، وہیں خود اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

سنعان کے سینے، ٹانگوں اور سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں جن کی بدولت اسے فوری طور پر شہر کے بڑے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروا دیا گیا تھا۔ پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ سنعان علی شاہد نے انزلہ شاہد کی محبت میں ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں کے ساتھ جھگڑا لیا۔ مختلف لوگوں کی زبانی مختلف قصے سن کر اس کی سماعتیں جیسے پھٹنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ کس مشکل سے دادی ماں کو راضی کر کے وہ بڑی ماں کو لے کر شہر پہنچی تھی جہاں نگاہوں کے بالکل سامنے ہی وہ آئی۔ سی۔ یو میں آکسیجن کے سہارے لمبے لمبے سانس لیتا، گویا اپنی محبت کے آخری امتحان سے گزر رہا تھا۔

زیست کی راہ پر گزرے ہوئے کچھ لمحوں میں ہم نے چاہا تھا تیرے ساتھ چلیں

تیرے ہونٹوں پہ ہنسی آنکھ میں جگنو بن کر
 دل کی دھڑکن میں سا کر تجھے جیتا دیکھیں

تیرے خوابوں کو سجالیں، ہم انہی آنکھوں میں
 تیرے چہرے کی اداسی کو خوشی میں بدلیں

اور کچھ رنگ بھی بھر دیں تیرے روز و شب میں
 پھر تجھے رنگ بہاروں کے چرا تا دیکھیں

زیست کی راہ پر گزرے ہوئے کچھ لمحوں میں
 ہم نے چاہا تھا

☆☆☆

پینے میں بری طرح شرابور ایک ہاتھ میں چھوٹی سی بچی کی انگلی تھامے، دوسرے

آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔“ نہایت شکستہ لہجے میں کہتے ہوئے خود اس کی آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے تھے، مگر کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے آنسو خود اسے بہت تکلیف دیتے ہیں۔

”آپ کس سے بھاگ رہے ہیں شانزل.....؟ سببیں سے، خود اپنے آپ سے یا پھر اپنی بے لوث محبت سے؟“ سرد طویل آہ فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے نہایت مدہم لہجے میں پوچھا تھا، جب وہ قدرے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”سنو..... کیا تم مجھے اس کرب سے باہر نکال سکتی ہو.....؟ کیا تم میری ہم سفر بن کر میرے سارے درد چن سکتی ہو، یا، بولو کیا ایسا کر سکتی ہو تم.....“

وہی لہجہ جو کچھ دیر قبل درد بن کر ساعتوں میں اتر رہا تھا۔ اس وقت ایک دم سے ٹھنڈی پھوار ثابت ہوا تھا اس کے لئے تبھی وہ دل کی منتشر دھڑکنوں پر بمشکل کنٹرول پاتی بظاہر نارمل لہجے میں بولی۔

”میں آپ کو سینے کی کوشش کر سکتی ہوں شانزل، قبل از وقت کوئی دعویٰ نہیں کرنا چاہتی۔“
”تھینکس۔“

زویا خان کے خلوص بھرے لہجے پر وہ اپنائیت سے اس کے سرد گال تھپتھپاتے ہوئے محض یہی کہہ سکا، یونہی مضطرب سے انداز میں دونوں ہاتھ جینز کی پائکس میں گھسائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہاں سے چلا آیا۔

اگلے پندرہ بیس دن اس کے شدید مصروفیت کی نذر ہو گئے۔ تب کہیں جا کر اسے زویا خان سے اپنی باقاعدہ انگریجٹ کے لئے تقریب منعقد کرنے کا وقت مل سکا۔ سحرش کے پاؤں تو مارے خوشی کے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے جب کہ خود ذیشان رحمانی نے بھی اس کے اس فیصلے کو دل سے سراہا تھا۔

آسانی کلر کے بھاری کام والے خولے صورت سے شلوار سوٹ میں، وہ بے حد دلکش دکھائی دے رہی تھی، جب کہ خود شانزل علی شاہ بھی آف وائٹ تھری پیس سوٹ میں بے حد وجیہ دکھائی دے رہا تھا، خوشی زویا خان کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ شانزل علی شاہ کو پا کر اس نے گویا پوری کائنات فتح کر ڈالی تھی۔ مگر خود شانزل علی شاہ کا دل اب بھی مطمئن نہیں تھا، جانے یہ کیسی بے کلی تھی جو کسی طور پر پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ مہمانوں سے بھرے گھر میں، اپنے عزیز واقارب کے لئے، بظاہر وہ بات بے بات مسکراتا رہا تھا، مگر وہ بالکل خوش نہیں تھا۔

سببیں کے ساتھ موجود چھوٹی سی بچی نے اسے دوبارہ اپنی راہ میں ایستادہ پا کر مدہم لہجے میں ریکویسٹ کی تھی جب وہ چونک کر بچی کی طرف دیکھتے ہوئے نم آنکھوں میں ڈھیر سارا کرب سیٹے سببیں پر آخری الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد بچی کو پیار کر کے سائیڈ پر ہو گیا۔

سفر آسان لگتا تھا

دل برباد تھو کو یہ سفر آسان لگتا تھا

ادھر تو سوچتا تھا اور ادھر

آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا

مگر خوابوں میں رہنا

خواب جیسی بے حقیقت، خوشبو صحرا میں رہنا ہے

کناروں سے جو ہو محروم، اس دریا میں رہنا ہے

دل برباد ہم نے تو کہا تھا

یہ سفر آسان لگتا ہے مگر آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے

دل کی کیفیت اس وقت بہت عجیب سی ہو رہی تھی، عجیب سی بے کلی اور بے تابی نے اس کے دل کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ قطعی اضطراب کے عالم میں اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے اور بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ عجیب روہانسا ہو رہا تھا۔ ضبط کے مارے آنکھیں جیسے سلگ رہی تھیں کتنی عجیب بات تھی کہ گھاؤ اس کے جسم پر لگے تھے، مگر تکلیف وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس رات وہ اتنا ڈیپر لیس تھا کہ زویا خان کے ملتے ہی اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑا تھا۔

”زویا..... وہ..... وہ کیوں اتنی تکلیف دے رہی ہے مجھے؟“

کوئی اس بل زویا خان کے دل سے پوچھتا کہ وہ کس طرح خون میں ڈوب کر ابھرا تھا مگر شانزل کی طرح اس نے بھی اپنا درد دھیمی سی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔

”تو آخر..... آپ کو اس سے محبت ہو ہی گئی ہے ناں؟“

نچلا ہونٹ دبا کر بظاہر مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ تڑپ کر اس کے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے بولا۔

”نہیں..... میں اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتا زویا لیکن پھر بھی نبانے کیوں وہ روتی ہے تو میرا جگر کٹ کر میری آنکھوں میں آ بیٹھتا ہے کوئی اسے تکلیف دیتا ہے تو اس کا درد میں اپنے پورے بدن میں پھیلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میں اسے دیکھی نہیں دیکھ سکتا۔ زویا، اس کی

محبت کا انوکھا قافلہ ہے
کہ اس کا ہر مسافر ہی لٹا ہے
تعلق جوڑنا اچھا ہے کتنا
تعلق توڑنا کتنا برا ہے
جدائی رنجگا، کرب مسلسل
چلو تم نے ہمیں کچھ تو دیا ہے

تقریب سے فراغت کے بعد، رات گئے تک اپنے کمرے میں تنہا، سرد ہواؤں کے
لمس کو چہرے پر محسوس کرتے ہوئے جانے کب تک درتچے میں کھڑا وہ ایک کے بعد ایک
سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔

☆☆☆

سبعین الہدیٰ آج کل سخت مشکلات کا شکار تھی۔ کیونکہ اس کا شوہر فیصل شہزاد احمد کی
عورت کے چکر میں بری طرح گرفتار ہوا تھا اور وہ عورت اسے خوب الو بنائے دونوں ہاتھوں
سے لوٹ رہی تھی۔ جس کی بدولت فقط کچھ ہی عرصے میں اسے کافی روپوں کا نقصان اٹھانا پڑا
تھا، کیونکہ بزنس سے اس کی توجہ قطعی طور پر ہٹ گئی تھی۔ کتنے ہی اہم کانٹریکٹ محض اس کی
لاپرواہیوں کی بدولت ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ لہذا کمپنی آج کل خسارے میں جا رہی تھی، مزید ستم
یہ کہ اس کے تکلیف دہ بی بیوی اور کم تنخواہوں کے باعث کمپنی کے بہت سے سینئر کارکنان اسے
الوداع کہہ کر دوسری مخالف کمپنیوں میں چلے گئے تھے سو آج کل وہ بے حد ڈپریشن رہتا تھا اور
اس کی یہ ڈپریشن سبعین الہدیٰ کے لئے عذاب بنی ہوئی تھی۔ شہر میں کوئی بھی تو نہ تھا، جو اس کی
سسکیاں سنتا اور آنسو پونچھتا بھائی تو بھلے وقتوں میں ہی سمندر پار جا بیٹھا تھا۔ ایک چچا کی فیملی کا
سہارا تھا سو وہ لوگ اپنی ساری پر اپنی سمیٹ کر پچھلے دنوں یورپ سیٹل ہو گئے تھے۔

فیصل کو جب بھی کسی بات پر غصہ آتا وہ اس کا پھول سا بدن بری طرح ادھیڑ کر رکھ
دیتا۔ عجیب جنونی فطرت پائی تھی اس نے پیٹنے پر آتا تو جب تک خود نہ تھک جاتا ہاتھ نہیں روکتا
تھا۔ سبعین پر اس کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اب وہ اکثر ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ شادی
کے بعد سے تاحال اس نے سکون کا ایک سانس بھی نہیں لیا تھا۔ شادی کی پہلی رات ہی فیصل
نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس نے یہ شادی محض اپنی بچی کی بہتر تربیت کے لئے کی ہے، وگرنہ
اسے ایک بیوی کی قطعی کوئی ضرورت نہیں لہذا آگے چل کر وہ اس سے کسی مہربانی کی توقع نہ

کرے وہ اسے توجہ پیار اور بچے کچھ بھی نہیں دے سکتا اور وہ اپنے قول پر تاحال قائم تھا، مگر وہ
تھکنے لگی تھی۔ دن رات ذہنی و جسمانی اذیت نے اسے تھکا ڈالا تھا زندگی میں جیسے خوشی نام کی
کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک جتنے اچھے دن دیکھے تھے اب زندگی
اتنے ہی برے دن دکھا کر اس سے جینے کا تاوان وصول کر رہی تھی۔

اگلے کچھ دنوں میں اس کا گھر بھی نیلامی کے دورا ہے پر آکھڑا ہوا تو کسی ہارے ہوئے
جواہر کی مانند ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کے شوہر نے شانزل علی شاہ کی مدد کو قبول کر لیا اور
اپنے گھر کا کچھ ضروری سامان لے کر شانزل علی شاہ کے وسیع خوبصورت گھر میں شفٹ ہو گیا۔
زندگی میں اس سے بڑھ کر ذلالت اور بے بسی کا مقام سبعین الہدیٰ کی زندگی میں
کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے مرجانا قبول تھا مگر اس شخص کی مدد لینا نہیں کہ جس کی وجہ سے وہ آج ان
حالات کو پہنچی تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی تقدیر و حالات نے اسے مجبور کر ڈالا تھا سو وہ اپنی
تقدیر پر محض روکتی تھی اور وہ رو رہی تھی۔

جس شخص کے تصور سے بھی اسے شدید نفرت تھی اب اسی شخص کی صورت اسے دن
میں کئی بار مجبوراً دیکھنا پڑتی تھی گو وہ حتی المقدور کوشش کرتی تھی کہ اس کا سامنا نہ ہو، مگر اسی کے
گھر میں ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے یہ سب ممکن نہیں تھا سو مجبوراً وہ صبر کے کڑوے گھونٹ
قطرہ قطرہ روح میں انڈیل رہی تھی۔

اس روز فیصل کسی ضروری بزنس میٹنگ کی وجہ سے آؤٹ آف سٹی تھا جب کہ اس کی
منہی گڑیا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی شانزل بھی تاحال گھر واپس نہیں آیا تھا۔ سول کا
بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آج سے بہتر موقع اسے کبھی میسر نہیں آ سکتا تھا۔ شب کے تقریباً گیارہ
بج رہے تھے اور وہ اپنے گھر سے ہونے والے دنوں کو یاد کر کے وسیع ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھی نجانے
کب سے سسکیاں بھر رہی تھی جب وہ نڈھال قدموں سے بیرونی دروازہ پار کر کے چھوٹے
چھوٹے سٹیپ اٹھاتا، ہال میں داخل ہو گیا۔ مدہم بلب کی روشنی میں کچھ بھی دکھائی دینا زیادہ
آسان نہیں تھا۔ سو یونہی کندھے پر کوٹ لٹکائے وہ سوچ بوری کی طرف بڑھ آیا مگر یہ کیا.....؟
راستے میں ہی وہ اپنی ریشمی زلفیں کھولے دونوں گھٹنوں پر سر ٹکائے زور و شور سے
سسکیاں بھر رہی تھی تب جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا شدید ضبط کے مراحل سے
گزر رہے ہوئے وہ جیسے تھک کر اس کے قریب آیا تھا۔

☆☆☆

دل کا سارا خون نچوڑ رہا تھا۔

رو رو کر اس کی آنکھیں خشک ہو رہی تھیں۔ مگر آج آنسو بے مول تھے۔ وہ جس کا دل ان آنسوؤں پر مچلتا تھا۔ وہ آج اپنی غلافی پلکیں موندے اس سے بے خبر بنا ہوا تھا۔ بڑی ماں خود اس کے لئے تپ رہی تھیں سک سک کر اس کی زندگی کے لئے دعائیں کر رہی تھیں۔ مگر اس کے ہونٹ ساکت تھے۔ آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں شیشے کے پار اسے زندگی اور موت کے لئے لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دل اس تصور سے ہی جیسے رکنے لگا تھا کہ ابھی ڈاکٹر اس کے پاس سے ہٹ کر باہر آئے گا اور کہے گا۔

”سوری..... ہم آپ کے مریض کو نہیں بچا سکے۔“

تب، تب کیا کرے گی وہ.....؟ اس کی زندگی میں تو جینے کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہے گا۔ سحان کے دوست اس کی زندگی بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ تب درد سے نڈھال وہ بھی دو زانوں ہو کر وہیں ہاسپٹل کے ٹھنڈے رخ فرش پر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں سے بھری نگاہیں اوپر آسمان کی طرف اٹھائے وہ عاجزی سے سک پڑی۔

”اے اللہ..... اے میرے مالک تجھے تیرے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تیری پاک محبت کا واسطہ اسے زندگی دے دے۔ اپنی پاک محبت کے صدقے میری محبت کو بچالے میرے مولا، مجھ بے بس کی صدا سن لے۔“ دل درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ مگر اس کے لب جیسے ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ موسم میں خشکی کا احساس بھی قدرے بڑھ گیا تھا۔ تبھی سحان کے روم کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر نہایت افسردگی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کی طرف چلا آیا۔ بڑی ماں تیزی سے ڈاکٹر کی طرف لپکی تھیں۔ مگر اس کا دل جیسے پتھر کی مانند ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ پھیلی آنکھیں سہم کر ڈاکٹر کے چہرے پر جیسے ٹھہر گئی تھیں۔ جو کھو گئی ہے وہی یادگار ہے شاید۔

☆☆☆

تیری تلاش میں پھر سے بہار ہے شاید
ملے تھے ہم جہاں موسم رکا ہوا ہے وہیں
کہیں کسی کو تیرا انتظار ہے شاید
سچی رات کے آنچل پہ شبنمی بوندیں
حیات پھر سے کہیں سوگوار ہے شاید

ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں

وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں

اگرچہ دل کی اداس اجڑی ہوئی راتوں میں

بکھر گئی ہیں

کئی زمانوں سے ساری باتیں، وہ گزری راتیں

سلگتی شاموں کے جلتے بجھتے الاؤ میں ہی، پکھل گئی ہیں

ادھوری باتیں..... ضروری باتیں

یہ خشک ہوئی ہوئی رگوں کی سیاہ قبروں میں نیم مردہ

ڈسی ہوئی خواہشوں کے ہمراہ گندھی ہوئی ہیں

آنکھ کی پتلیوں پہ تھک کے

ٹھکتی پلکوں پہ سو گئی ہیں

تمام باتیں درست جاناں، تمام خدشے بجا ہیں لیکن

ہر ایک امکان زندگی میں

انہی کی یادیں بھٹک رہی ہیں

انہی کے دم سے صفت جذبول، ٹھہرتے لفظوں بجھی تمناؤں میں رقت ہے

ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں، وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں

خیال رکھنا..... ادھوری باتیں بھلا نہ دینا

وہ گزری باتیں بھلا نہ دینا

خیال رکھنا..... خیال رکھنا

آئی۔ سی۔ یو کے باہر کھڑی آنسوؤں سے تر چہرہ شیشے پر ٹکائے وہ چپ چاپ رو

رہی تھی جب کہ اندر وہ ہوش و حواس سے بے خبر آکسیجن کے سہارے بمشکل سانس لیتا ہوا لمحہ

گویا زندگی سے دور ہو رہا تھا وہ اس کے عشق میں مبتلا نہیں تھی، مگر پھر بھی اس کے ایک ایک

سانس کے ساتھ اُسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ زندگی کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے۔

آج اسے پتہ چل رہا تھا۔

وہ جو سب کے لئے عذاب کی صورت تھا۔ بے انتہا طاقت کے نشے میں چور سب پر

قہر بنا ہوا تھا۔ آج کس قدر بے بسی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ زندگی سے دور ہوتے ہوئے گویا اس کے

میری نظر سے جو مجھ کو گرا نہیں سکتا
تمہاری آنکھوں میں، وہ اختیار ہے شاید
وسیع ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے وہ زور زور سے سسکیاں بھر رہی تھی
جب شانزل علی شاہ نے ہر طرح کے انجام سے بے نیاز ہو کر آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے
کندھے پر رکھ دیا۔

سارے عالم سے بے خبر ہو کر روتی بلکتی سبعین الہدیٰ نے لمحے کے ہزارویں حصے
سے قبل سرا سیمہ ہو کر گھٹنوں سے سراٹھایا تھا، مگر پھر جونہی اسے اپنے قریب پایا تنہا سے اس کا
ہاتھ پرے جھٹکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا.....؟“ روکیوں رہی ہو تم.....؟“ قطعی برا منائے بغیر وہ انتہائی سنجیدگی کے
ساتھ اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا جب وہ اس کی طرف نگاہ کئے بغیر قدم
درشت لہجے میں بولا۔

”زندگی کی سنگدلی پر رونا آرہا ہے مجھے، اپنے بخت کی بے بسی پر آنسو بہا رہی ہوں
میں، کیونکہ..... کیونکہ جس شخص کے تصور سے بھی مجھے گھن آتی ہے۔ آج حالات نے اسی شخص
کے در پر حقیر کر کے لا پھینکا ہے مجھے.....“ رندھے ہوئے لہجے میں بولتی۔ وہ اس کا دل دکھا گئی
تھی مگر شانزل نے اپنا ضبط کھونے نہیں دیا۔

”میں نے تمہاری مدد کی ہے سبعین مشکل وقت میں سہارا دیا ہے آج اگر حالات
نے تمہیں میری پناہ میں آنے پر بے بس کر دیا ہے تو اس میں میری کیا غلطی ہے۔ میں نے تو
صرف نیکی کی ہے باقی جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار میں نہیں خود تمہارا شوہر ہے
کیونکہ میں سمجھاتی ہوں اسے یہ نفرت غصہ کبھی اسے بھی دکھاؤ سبعین تاکہ اسے بھی تمہاری کک کا
کچھ احساس ہو سکے۔“

وہ خواہ جتنا بھی خود سے بے نیاز رہتا، کتنا ہی مضبوط ظاہر کرتا، خود اس کے رو برو آ
کر تو بکھر جایا کرتا تھا۔

”ہاں..... شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم..... آج مجھے جو بھی حالات درپیش ہیں، بھلا
ان کے لئے تمہارا تصور کہاں نکلتا ہے تصور وار تو میں ہوں مسٹر شانزل علی شاہ کہ میں ذیشان
رحمانی کی بہن ہونے کے جرم میں کڈ نیپ ہو گئی ہوں میں ہی گتہ گار ہوں کہ میں نے شعور رکھتے
ہوئے بھی فیصل شہزاد احمد جیسے نفسیاتی مریض سے شادی کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ میرے پاس اس سے

ہٹ کر دوسرا کوئی قابل قبول راستہ نہیں تھا اس شادی سے انکار کا مطلب تھا کہ میں تمہارا پر پوزل
قبول کر کے لوگوں کے گھٹیا ذہنوں کو سچائی کا ثبوت فراہم کر دیتی، زندگی بھر خود اپنے آپ سے
نظریں چرا کر سکتے ہوئے جیتی رہتی ہوں..... درست کہتے ہو تم زندگی میں تصور وار تو ہمیشہ عورت
ہوتی ہے تم مرد نہیں..... اپنا ہر سکھ ہر خوشی تم پر وار کر ہمیشہ دکھ اٹھانے والی عورت ہی تو تصور وار
ہوتی ہے جسے..... جسے تم لوگ بھی معمولی سی خطا پر قتل کر ڈالتے ہو یا پھر..... اپنی جھوٹی شان اور
وقار کا بھرم رکھنے کے لئے اپنی مرضی سے اپنے ہی جیسے کسی دوسرے مرد کے کھونٹے سے باندھ
دیتے ہو، عورت ہی تو تصور وار ہوتی ہے شانزل علی شاہ جو کفن سرہانے رکھ کر بھی بیٹی پیدا کرنے
کے خوف سے سہی رہتی ہے اپنی تکلیف کا احساس نہیں کرتی تمہاری خوشی کا سوچ سوچ کر گھل
جاتی ہے قبر کے تاریک اندھیروں میں اتر جاتی ہے۔“ آنسوؤں کا سلسلہ اس کے گالوں پر بہہ نکلا
تھا مگر اس نے انہیں صاف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”تم..... کہیں بھی کہاں تصور وار ہوتے ہو شانزل علی صاحب، تصور تو ہمارا ہوتا
ہے۔ جو کبھی باپ کی عزت پر اپنا آپ قربان کر دیتی ہیں تو کبھی بھائیوں کے وقار پر خود اپنے
حسین خوابوں کا گلا گھونٹ کر ساری عمر خوش رہنے کی کوشش میں ان کے گولوں کی مانند ادھڑتی
ہی چلی جاتی ہیں کبھی اپنے لئے نہیں سوچتیں کبھی اپنے من کی خوشی کی پرواہ نہیں کرتیں..... بس
..... بکھرتی ہی چلی جاتی ہیں..... شدت کرب سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ جب شانزل نے پھر
سے ہمت کا دامن پکڑتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”آج دل کا سارا غبار نکال لو سبعین چاہو تو میرے کندھے پر سر رکھ کر سارے آنسو
بہا دو مگر..... مجھے بتاؤ میں جو خطا کر چکا ہوں اب اس کی تلافی کیسے ممکن ہے؟“
شانزل کے سوال پر وہ اپنے حواس میں واپس آئی تھی، تبھی شاید چونک کر خالی خالی
نگاہوں سے کچھ پل اس سمت دیکھنے کے بعد اس نے قطعی خاموشی کے ساتھ اپنے قدم آگے
بڑھا دیئے۔

”میری بات سنو سبعین پلیز.....“ لپک کر اس کی کلائی تھامتے ہوئے اس نے تھکے
لہجے میں کہا تھا جب وہ نفرت سے اسے پرے دھکیلتی ہوئی بولی۔

”ڈونٹ ٹچ می مسٹر شانزل علی شاہ صاحب..... حالات نے مجھے بے کس کر کے اگر
آپ کے دورا ہے پر لا پھینکا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ جو چاہیں گے میرے ساتھ
کریں گے میں نفرت کرتی ہوں آپ سے بنا آپ نے بے حد نفرت کرتی ہوں میں آپ

کا چونک جانا فطری بات تھی تاہم فیصل کی نگاہ جیسے اس پر پڑی وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے..... رک کیوں گئے شانزل صاحب، پلیز آئیے ناں.....“

شانزل سر جھٹک کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تو وہ پھر قدرے دوستانہ لہجے میں مسکراتے

ہوئے بولا۔

”میں نے سوچا کہ آپ روز ناشتے کے لئے ملازمہ کے ہاتھوں خوار ہوتے ہیں تو کیوں ناں آپ کو ہماری بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کا صاف ستھرا ناشتہ پیش کیا جائے آخر ایک ہی گھر میں تو رہ رہے ہیں ہم۔“

شانزل کو اس کے الفاظ پسند نہیں آئے تھے مگر پھر بھی اس نے مسکرا کر فیصل شہزاد احمر کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”ذیشان کی کوئی خبر نہیں آئی وہاں سب ٹھیک تو ہے ناں شانزل صاحب.....؟“

سبعین ان دونوں کے لئے چائے ٹیبل پر رکھ چکی تھی جب پھر سے فیصل شہزاد احمر نے اسے مخاطب کیا جواب میں وہ ایک سرسری نگاہ سبعین الہدیٰ کے سپاٹ چہرے پر ڈالنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”کل ہی اس سے بات ہوئی تھی میری۔ بالکل خیریت ہے وہاں پر بلکہ ذیشان تو وہاں اپنا باقاعدہ پلانٹ لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔“

”اچھا..... مگر مجھ سے تو اس کی ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی سبعین نے کچھ بتایا.....“

شانزل دیکھ سکتا تھا کہ اس کے الفاظ پر پل دو پل کے لئے چائے میں چینی ملائی سبعین کے ہاتھ ہلکے سے کپکپائے تھے، تبھی وہ بات سنبھالتے ہوئے بولا۔

”سبعین کو اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کیونکہ ذیشان نے میرے علاوہ اور کسی سے یہ بات ڈسکس نہیں کی ویسے بھی اسے وہاں نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے لئے تھوڑے سے مسائل کا سامنا ہے کچھ پیسے کی پرابلمز بھی ہیں۔“

وہ فیصل کی بدنیت سے بخوبی واقف تھا تبھی سبعین اور ذیشان کو صاف بچا گیا تو فیصل شہزاد اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا سبعین اب اسے چائے بنا کر تھما رہی تھی شانزل سے پوچھ بغیر اس نے اپنی مرضی سے ہی ڈیزھ جج بھر کر چینی کے ڈال دیئے تھے۔ مگر شانزل چونکہ بہت کم چینی لیتا تھا۔ لہذا پہلا گھونٹ بھرتے ہی حلق میں پراہلم ہو گئی۔ چائے کا کپ واپس ٹیبل

سے.....“ اپنا آپ جھٹک کر چلاتے ہوئے وہ آخر میں رو پڑی تھی جب شانزل نے آہستہ سے اس کے آنچل کو تھام لیا۔

”میں تمہارے آنسو چٹنا چاہتا ہوں سبعین.....“

عجب بے بس سا لہجہ تھا اس کا تبھی ایک مدہم ہی طنزیہ مسکراہٹ سبعین الہدیٰ کے لبوں پر رینگ گئی۔

”میری آنکھوں سے بکھرتے آنسوؤں کی قسمت میں سمٹنا نہیں لکھا شانزل علی صاب..... وگرنہ میں انہیں کبھی بکھرنے ہی نہیں دیتی۔“ نم نم سے لہجے میں آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کم صم کھڑے شانزل علی شاہ سے کہا پھر چند قدم آگے بڑھ کر اچانک پیچھے پلٹتے ہوئے بولی۔

”میں جانتی ہوں کہ تم کبھی میری خوشی نہیں چاہ سکتے۔ مگر پھر بھی اگر تمہارا دعویٰ ہے تو پلیز جب تک میں یہاں ہوں میری آنکھوں سے دور رہو پلیز۔“

آخری الوداعی نگاہ اس کی کرب چھلکاتی آنکھوں میں ڈالنے کے بعد وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جب کہ نڈھال کھڑا شانزل علی تھکے تھکے سے قدموں سے وہیں گھٹنوں کے بل دو زانوں ہو کر زمین پر بیٹھ گیا عجیب زندگی ہو گئی تھی اس کی وہ تکلیف میں ہوتی تھی لہجی اسے درد ہوتا تھا اور وہ تکلیف دیتی تب بھی اسے درد سمیٹنا پڑتا تھا۔

شب کے تقریباً دو بج رہے تھے مگر نیند آج اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ضبط کے اڑے مراحل میں سلگتی آنکھیں اپنے انمول موتی اپنے ہی اندر چھپائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ اس درد کو جھٹکنا چاہتا تھا زندگی میں پوری طرح سے محو ہو کر چین کی نیندیں سونا چاہتا تھا، مگر..... جانے کیوں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل سبعین الہدیٰ کی مٹھی میں ہے وہ جسب چاہے گی جیسے چاہے گی اس کے دل کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرے گی۔

اس رات وہ بہت دیر تک جاگا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے تسلسل میں بنتی ادھرتی سبعین الہدیٰ کی تصویر نے دیر تک اسے سخت ڈسٹرب کئے رکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب وہ ناشتے کے لئے بستر سے نکلا تو اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

ناچاہتے ہوئے بھی اسے ہاتھ لے کر آفس کے لئے تیار ہونا پڑا تھا۔ پھر جس وقت وہ ناشتے کے لئے ڈائننگ ٹیبل کی طرف آیا وہاں پہلے سے فیصل شہزاد احمر کو براجمان پا کر ٹھٹھک گیا انہیں اس گھر میں آئے ہوئے تقریباً ہفتہ ہونے کو آیا تھا، مگر ابھی تک انہوں نے اپنا رہن سہن شانزل سے الگ ہی رکھا تھا لہذا اس وقت فیصل شہزاد احمر کو اپنے ڈائننگ ٹیبل پر دیکھ کر اس

پر رکھ کر وہ بری طرح سے کھانا تھا، جب اس کے مقابل بیٹھے فیصل نے قدرے تھکر سے اس پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد ایک زوردار چائنا پہلو میں کھڑی سبیین الہدیٰ کے چہرے پر جڑ دیا اس کی اس حرکت پر شانزل نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا تھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

”ذلیل پھو ہڑ عورت..... زندگی میں سوائے آنسو بہانے کے اور کوئی کام سیکھا ہے تم نے کیوں ہر جگہ میری ناک کٹوانے پر تلی رہتی ہو.....“

”پلیز سٹاپ اٹ فیصل صاحب..... سبیین کا کوئی قصور نہیں میری ہی غلطی تھی میں نے گھونٹ زیادہ بھر لیا تھا.....“ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ فیصل کا سبیین پر اٹھنے والا ہاتھ توڑ کر رکھ دیتا، مگر فیصل نے اس کے کرخت لہجے کی پروا کئے بغیر اس سے ایکسکیوز کرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ اسے نہیں جانتے مسٹر شانزل بڑی مکار عورت ہے کسی نے قبول نہیں کیا تو لے کر یہ بلا مرے سر منڈھ دی گئی۔ ہونہہ..... اسی کی منحوس کی وجہ سے آج برے حالات کا شکار ہوں میں، مگر نہ اچھی بھلی عیش میں، زندگی گزری ہے میری۔“

شانزل نے دیکھا کہ اس کے الفاظ پر وہ محض آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا گئی تھی تب شاید دکھ اور ندامت کی کیفیت میں مبتلا وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

”مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے؟ بہر حال میں آپ کو انعام کرنا چاہ رہا تھا کہ میں اگلے چند روز میں برنس ٹور پر یورپ فلائی کر رہا ہوں۔ اس دوران آپ چاہیں تو میرا چارج یہاں سنبھال سکتے ہیں آئی ہوپ کہ میرے واپس آنے تک آپ ان برے حالات سے باہر نکل آئیں گے۔“ قطعی دھیمے لہجے میں کہنے کے بعد وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں نہیں رکا تھا جب کہ فیصل شہزاد احمد کی تو خوشی سے چہرہ کھل گیا تھا اتنے بڑے کاروبار اتنے شاندار آفس میں چیف کی سیٹ سنبھالنا تو ان کٹھن حالات میں کوئی معجزہ ہی تھا اس کے لئے وہ سرعت سے شانزل علی شاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس کا موقع دیئے بغیر تیزی سے باہر کی جانب لپک گیا۔

رات میں اس کی واپسی بہت لیٹ ہوئی تھی تھکن کے مارے اس کا حال برا ہو رہا تھا اعصاب بے حد مضرب ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت صرف اور صرف لمبی اور پرسکون نیند سونا چاہتا تھا مگر سامنے ہی لاؤنج میں صوفے پر سبیین الہدیٰ کو ڈسٹرب بیٹھے دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھ آیا۔

”السلام علیکم..... کیا بات ہے، کیا فیصل نہیں آیا ابھی تک۔“

شانزل کے سوال پر وہ اپنی سوچوں سے چونکی تھی پھر قدرے غائب دماغی سے سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد آہستہ سے نفی میں سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جب کہ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب ہو کر رہ گیا۔ خدا خدا کر کے رات گئے بمشکل اسے نیند آئی تھی کہ اچانک کسی نے زور سے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ سخت ڈیپریشن کے عالم میں سستی سے بیدار ہو کر وہ کمرے کے دروازے تک آیا، مگر دروازے کے اس پار آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کے ساتھ از حد پریشان سبیین الہدیٰ کو کھڑی دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”وہ..... وہ گڑیا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فیصل کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ پپ..... پلیز میری مدد کرو.....“ اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ وہ اس شخص سے بے انتہا نفرت کرتی ہے تبھی شاید اس کی سوالیہ نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اس نے التجا کی تو وہ بھی اپنی ساری تھکن ساری ڈیپریشن بھلائے تیزی سے واپس پلٹ کر غمض پہنتے ہوئے اس کے ہمراہ چلا آیا۔

محل سے ”شانزل ہاؤس“ میں عجیب سنائے کا راج تھا۔ شانزل نے فوراً اپنی گاڑی نکالی، پھر ننھی گڑیا کو بانہوں میں اٹھا کر گاڑی کی پیچلی سیٹ پر لٹایا اور سبیین کے لئے فرنٹ ڈور کھول کر اس کے بیٹھے ہی خود بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ تھکن سے پُر اعصاب پر اس کی سسکیاں کوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ مگر کتنی عجیب بے بسی تھی کہ وہ اسے رونے سے منع بھی نہیں کر سکتا تھا کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں تھا اس پر تبھی ضبط سے ہونٹ بھینچتے خاموشی سے فاسٹ ڈرائیونگ کرتا رہا۔

ٹیمپریچر بڑھ گیا تھا جس سے اس کی حالت بگڑ گئی تاہم شانزل کی ہدایت پر اسے فوری چیک کر کے اسپیشل ٹریٹمنٹ دی جا رہی تھی اور ادھر ماں نہ ہونے کے باوجود سبیین کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ شانزل ڈاکٹرز سے ضروری امور ڈسکس کرنے کے بعد اس کی طرف آیا تو وہ اسے دیکھتے ہی ہلک کر رو پڑی۔

”ریلیکس سبیین..... گڑیا کو کچھ نہیں ہوگا ڈاکٹرز دیکھ رہے ہیں اسے سنبھالو خود کو..... سبیین کے قریب پہنچ کر جو نبی دوستانہ انداز میں اپنائیت سے اس نے کہا وہ شدید تھک کر نڈھال ہوتی ہوئی اس کے کندھے پر سر ٹھکا کر سسک اٹھی۔ شانزل علی۔ اس لمحے جیسے پوری کائنات تھم گئی تھی۔

☆☆☆

باہر سے کچھ ڈاکٹرز آئے تھے اور سبیین کو آپریشن تھیٹر میں پھر سے منتقل

اسے مجھ سے پیار ہو جاتا تو میں ایک بل کے لئے بھی اس کے سامنے سے نہ ہٹتی۔ آنکھیں بند کر کے سرد آہ بھرتے ہوئے وہ پھر مسکرائی تھی۔

”بڑی بے شرم ہو گئی ہے تو..... وہ دیکھ وہ ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔“

”ہاں..... اور بڑے مزے سے مسکرا بھی رہا ہے۔“ اس کی گھبراہٹ کو انجوائے کرتی وہ پھر کھلکھلائی تو انزلہ نے اپنا سر تھام لیا۔

”تو کبھی نہیں سدھرنے والی چل اٹھ یہاں سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“ مونا کا ہاتھ تھام کر وہ کھڑی ہوئی تو ادھر قدرے فاصلے پر کھڑے سمعان علی شاہد کی آنکھوں کا اضطراب بڑھ گیا۔

”ہائے میں مر جاؤں۔ وہاں قیس کی آنکھیں نہیں سیراب ہو رہیں اور یہاں لیلی بیگم کے خمرے آسمان کو چھو رہے ہیں۔“ مونا نے اس کے یوں اچانک لان سے اٹھ کر چل دیے کو ناپسند کیا مگر انزلہ نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

اسی روز چھٹی کے بعد وہ دونوں یونیورسٹی سے نکل کر پیدل ہی اپنے روٹ پر روانہ ہوئیں تو راستے میں ہی یونیورسٹی کے کچھ آوارہ لڑکوں سے ٹکراؤ ہو گیا تو انزلہ نے شدید مشتعل ہو کر ایک لڑکے کے گال پر زور دار تمانچہ بڑا دیا تھا جس سے وہ فوراً حیوانیت پر اتر آیا۔ روڈ قدرے سنسان تھا مگر پھر بھی ارد گرد گزرتے اکا دکا لوگ رک کر تماشہ دیکھنے لگے تھے کہ اسی پل اپنے دوست کے پیچھے بایک پر بیٹھے سمعان علی شاہد نے انزلہ کا بازو اس آوارہ لڑکے کی گرفت میں دیکھ لیا۔ مخالف پارٹی بگڑے ہوئے رئیسوں کی پارٹی تھی، مگر خون جھلکا کی نگاہوں میں غصے سے بے حال سمعان علی شاہد نے بالکل اس کی پرواہ نہیں کی اور بایک روک کر اس رئیس زادے کی طرف لپکتے ہوئے جو اس کی پینائی شروع کی تو پھر اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ سمعان کا دوست بھی اس لڑائی میں کود پڑا تھا جب کہ باقی لوگ محض تماشہ دیکھ رہے تھے۔

مخالف پارٹی میں لڑکوں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی لہذا بے پناہ طاقت رکھنے کے باوجود سمعان اور اس کا دوست شدید زخمی ہو گئے تھے تاہم اپنے رستے خون کی پرواہ کئے بغیر وہ انزلہ کو چھیڑنے والے آوارہ لڑکوں سے اس وقت تک جھگڑتا رہا تھا جب تک کہ وہ خود اپنی جان بچاتے ہوئے وہاں سے بھاگ نہیں گئے انزلہ اس کے سر سے بہتا خون اس کے چہرے پر بہتے ہوئے دیکھ کر ہراساں ہو گئی تھی تبھی اسے فارغ ہو کر اپنی طرف آتے دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”یہ..... یہ کتنا خون نکل رہا ہے آپ کے سر سے، پپ..... پلیز جلدی سے ڈاکٹر

سمعان کے آدمی خون کا انتظام کرنے کے لئے بھاگ دوڑ رہے تھے جب کہ وہ عجیب سے حلیے میں ایک طرف گم سم بیٹھی قرآن کی مختلف سورتوں کا ورد کر رہی تھی اس وقت اسے نہ تو دنیا کی کوئی پروا تھی نہ ہی موسم کی خشکی کا احساس وادی ماں اسے پچھلے بیس منٹ سے دو تین بار واپس چلنے کے لئے کہہ چکی تھیں مگر اس نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ سوچ کی قرطاس پر بھلا کسی سنی دادا کا تصور ہی کہاں تھا وہ تو محض اپنے اس معصوم سے جذبے کے لئے رو رہی تھی، جو آج سے کچھ سال پہلے کسی سمعان علی شاہد نے اس کے دل میں بھر دیا تھا۔ وہ معصوم سا جذبہ جو اس کے دل کی سرزمین سے محبت کا روپ لے کر اٹھا تھا، مگر اسے پنپنے سے قبل ہی موت نے آدو چا وہ ایک ننھا سا پھول جو ابھی ٹھیک سے کھل بھی نہ پایا تھا کہ سمعان علی شاہد کی اچانک جدائی کی دھوپ میں کھلنے سے قبل ہی مر جھا کر رہ گیا۔

جھیل سی غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کے تسلسل کے ساتھ ہی ماضی کے کچھ سہانے لمحے چھم سے در آئے۔ اس روز موسم بے حد حسین ہو رہا تھا وہ محض اپنی دوست کے اصرار پر نا چاہتے ہوئے بھی یونیورسٹی چلی آئی تھی، خوبصورت وسیع یونیورسٹی کے سرسبز و شاداب لان میں دھوپ سینکتے ہوئے اس کا پورا گروپ خوش گپیوں میں مصروف تھا جب اچانک اس کی دوست کی نگاہ کچھ ہی فاصلے پر دوستوں کے جھرمٹ میں کھڑے سمعان علی شاہد پر پڑی اور وہ اسے دیکھ کر چپک اٹھی۔

”اے انزلہ، وہ دیکھ تیرا دیوانہ آج بلیک سوٹ میں کتنا شاندار دکھائی دے رہا ہے، جا، جا کے نظر اتار دے اس کی.....“

سمعان علی شاہد کی آنکھوں میں انزلہ کے لئے چھلکتی وارفتگی اس کی فاسٹ فرینڈ مونا سے مخفی نہیں رہ سکی تھی تبھی وہ موقع بے موقع جہاں سمعان علی شاہد کو موجود پاتی اسے تنگ کئے بغیر نہیں رہتی تھی اس وقت بھی اسے کہنی مارتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تو انزلہ بری طرح گھبرا کر اسے ڈانٹنے لگی۔

”شرم کرو کچھ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہو، یونہی کسی کے کان میں پڑ گئی تو ایسے ہی بات کا بنگلہ بن جائے گا۔“

”بنتا ہے تو بن جائے وہ کیا کہتے ہیں سیانے کہ عشق اور عشق چھپائے نہیں چھپتا۔“ ادھر مونا پر جیسے اس کی خشکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”ویسے تو ہے بہت خوش قسمت کہ سمعان جیسا ڈشنگ بندہ تجھ پر مر مٹا، آہ..... کاش

دوپہر میں چھٹی کے بعد مونا اس کی طرف آئی تو اس نے بتایا تھا کہ سنعان نے اس آوارہ رئیس زادے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام بگڑے ہوئے دستوں کو بھی یونیورسٹی سے آؤٹ کر دیا تھا۔ تب وہ جان پائی تھی کہ سنعان علی شاہد محبت اور غیرت کے معاملے میں کس قدر شدت پسند ہے۔

یونیورسٹی میں کئی بار اس نے سنعان کو ایلان سے بھی بلا وجہ الجھتے دیکھا تھا۔ مگر محبت کے معاملے میں وہ اتنا جذباتی ہوگا کہ خود اپنی جان کو داؤ پر لگا دے گا، اس کا اندازہ تو اس وقت ہی کر پائی تھی وہ، کہ جب وہ زندگی اور موت کے درمیان ڈولتے ہوئے ساکت پڑا تھا۔

انزلہ کا من چاہا کہ وہ زور زور سے چلائے کہ سنعان اس کی پکار سن کر اپنی آنکھیں کھول دے مگر..... وہ نہیں چلا سکی..... چیخ چیخ کر رو بھی نہیں سکی۔ عجیب بے حال سے حلیے میں گم صم سی بیٹھی بس روتی رہی اور دل ہی دل میں خدا سے اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔

ماحول میں خنکی کا احساس گزرتے ہر پل کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا دادی ماں اب اس پر بے حد غصہ ہو رہی تھیں مگر اس کا دل تھا کہ سنعان کے لئے کوئی اچھی خبر سننے تک وہاں سے جانے پر راضی ہی نہیں ہو رہا تھا۔ تبھی شاید خدا کو اس کی حالت پر رحم آیا تھا اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں ڈاکٹر نے سنعان کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی نوید سنائی تھی تب وہیں اپنی جگہ پر تشکر کے آنسو لٹاتی وہ خدا کے حضور سجدے میں گر پڑی دل میں اودھم مچاتے خوفناک وسوسے منہ مچھا کر خاموش بیٹھ گئے سلگتی جلتی آنکھوں میں قدرے اطمینان اتر آیا تو وہ دل کو سمجھاتی دادی ماں کے ساتھ مجبوراً گاؤں واپس چلی آئی۔

☆☆☆

آکسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں
جس طرح مرد جواں پر دیہاتوں میں
بوڑھیاں روتے ہوئے بین کرتی ہیں
جس طرح ایک سیاہ پوش پرندے کے کہیں گرنے سے
ڈار کے ڈار زمینوں پر اتر آتے ہیں
چیختے، شور مچاتے ہوئے، کراہتے ہوئے
اپنے محروم رویوں کی المناکی پر
اپنی تنہائی کے ویرانوں میں چھپ کر رونا

”یو ڈونٹ وری..... آپ تو ٹھیک ہیں ناں۔“
اپنے زخموں سے قطعی بے نیاز دلکشی سے مسکراتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا
جب انزلہ نے سرعت سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چلا کر قریب سے گزرتی ٹیکسی روکی اور
مونا و سنعان کے دوست کے ساتھ بیٹھ کر فوراً قریبی کلینک پہنچنے کا آرڈر دے دیا۔
”کہا بھی تھا میں نے کہ جا کر اپنے شہزادے کی نظر اتار آؤ، مگر تم نے میری نصیحت
نہیں سنی اب نتیجہ دیکھ رہی ہوناں۔“

سنعان مرہم پٹی کر وارہا تھا جب مونا نے پھر سے اس کے کان میں سرگوشی کی مگر اس
بار اس کی یہ سرگوشی انزلہ کے ساتھ ساتھ سنعان کے دوست کی سماعتوں تک بھی بخوبی پہنچی تھی
تبھی وہ کن اکیوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر بولا۔
”میرا یار تو ہر روز نظر میں چتا ہے یہ کب تک نظر اتارتی رہیں گی اس کی۔“
اس کے الفاظ پر انزلہ کے ساتھ ساتھ مونا نے بھی چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی
اور پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سا تبسم دیکھ کر گھبراتے ہوئے رخ پھیر گئی۔
”اف اللہ..... یہ میری زبان بھی کبھی چپ نہیں رہ سکتی۔“
نگاہیں چرا کر دھیمے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی
تھی جب سنعان ڈاکٹر سے فارغ ہو کر ان کی طرف چلا آیا۔

”چلیں انزلہ، ناؤ آئی ایم آل رائیٹ، آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں
گے۔“ مضبوط کلائی پر بندھی گولڈن ریٹ وایج پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ شائستگی سے بولا
تھا جب اودھم مچاتی دھڑکنوں پر بمشکل کنٹرول پاتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
”ہاں..... لہل..... لیکن آپ کو اس طرح سے ان لوگوں کے ساتھ جھگڑنا نہیں چاہیے
تھا، وہ..... وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“

”جانتا ہوں، مگر میرے لئے عزت کی اہمیت جان سے کہیں بڑھ کر ہے، بہر حال
ان لوگوں سے میں کل خود ہی نپٹ لوں گا، آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔“
اتنے سارے زخم کھا کر بھی وہ کس قدر مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

اس روز انزلہ کو اس پر بہت پیار آیا تھا رات بھر سنعان علی شاہد کے تصور نے اسے بے
قرار کیا تھا، مگر وہ اسے تیز بخار تھا اور وہ دل جانتے ہوئے بھی یونیورسٹی نہ جاسکی۔

اجنبیت کے گھناؤپ بیابانوں میں
شہر سے دور سیاہ غاروں میں چھپ کر رونا
ایک نئے دکھ کے اضافے کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی ہی ذات کے کنجھل میں الجھ کر رونا
ان گمراہ مقاصد سے وفا ٹھیک نہیں
ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوا کیں پھر بھی
آکسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں

دروازہ ہلکے سے پیش کرنے کے بعد وہ سعنان علی شاہد کے کمرے میں داخل ہوئی تو
دل عجیب سی کک کی پلیٹ میں تھا۔ آج دو دن کے بعد وہ دوبارہ اسے دیکھ رہی تھی اور یہ دو دن
اس نے جتنی اذیت میں گزارے تھے۔ بس اس کا من ہی جانتا تھا۔ آج بھی دادی ماں نے اسے
بڑی مشکل سے بڑی ماں کے ساتھ آنے کی اجازت دی تھی۔ سعنان کی طبیعت اب پہلے سے
کافی بہتر تھی، مگر تاحال وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوش و حواس سے بے خبر تھا۔
انزلہ کو اس وقت اس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت بکھری دکھائی دے رہی
تھی۔ اس کا من چاہا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کسی ایسی دنیا میں لے جائے کہ جہاں کوئی
اس سے نفرت کرنے والا نہ ہو، کوئی اسے بددعا کیل دینے والا نہ ہو۔
بڑی ماں کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرنے کے بعد، سعنان کے کسی آدمی کے ہمراہ ڈاکٹر
کے پاس چلی گئی تھیں تب وہ کرسی گھسٹ کر سعنان کے بیڈ کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ
تھام کر رو پڑی۔

”میری محبت میں اور کتنے امتحان دو گے سعنان.....؟ اور کتنا ستاؤ گے خود کو.....“
جھیل سی غزالی آنکھیں، روانی سے آنسو لٹا رہی تھیں اور دل ایک انجانے سے درد
سے رکا جا رہا تھا غم کی شدت سے گلا رندہ گیا تھا جب اچانک سعنان کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش
پیدا ہوئی اور اس نے اگلے ہی پل آنکھیں کھول دیں پل دو پل کے لئے دونوں نے ٹھٹھک کر
ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا تھا تبھی انزلہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے
مزید شدت سے رو پڑی۔

”کس..... سوری سعنان..... آئی ایم ویری سوری۔“

وہ اب بھی بغور اس کی آنکھوں سے برستے موتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھلا..... کوئی اس

کے لئے یوں اتنی شدت سے رو بھی سکتا ہے؟ اس کے لئے تو اپنی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں تھی
اپنی زیست کا ٹھنڈا چراغ بڑی بے نیازی سے حالات کی بے رحم ہواؤں کے سپرد کر چھوڑا تھا
اس نے اور..... وہ اس کی محبت..... اُس کی زیست کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اپنے قیمتی آنسو لٹا
رہی تھی واقعی سر پر انزلہ اس کے لئے محبت کرنے کی خطا تو محض اس سے سرزد ہوئی تھی اور اب
اس محبت سے ملنے والے زخموں کے لئے بھی وہ محض خود کو سزاوار سمجھ رہا تھا پھر وہ کیوں رو رہی
تھی اسے کس بات کا درد بے حال کر رہا تھا؟“

انزلہ شاہ کی خوبصورت آنکھوں سے نکھرتے موتی دیکھ کر اس نے بیٹھنا چاہا تھا مگر
سینے پر لگے زخموں کے باعث کراہ کر رہ گیا، تبھی وہ لپک کر اس پر جھکی تھی۔

”لیٹے رہو سعنان..... پلیز.....“

عجیب سا کرب مچلا تھا اس کی آنکھوں میں جس سے وہ مزید شاکدہ رہ گیا۔
”کیوں کیا تم نے ایسا.....؟ میں تو محض تمہیں ستانا چاہتی تھی صرف تمہارے پیار کی
شدت کو آزمانا چاہتی تھی اور تم نے..... تم نے اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا، کیوں سعنان.....؟ اتنا
حقیر سمجھتے ہو خود کو.....؟ وہ اب بھی ساکت تھا اور انزلہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تم نے میرے بارے میں بھی نہیں سوچا..... مم..... میں تمہارے بغیر کیا کرتی.....؟“

بول.....“

یہ آنسو، یہ اس کے پیار کی شدت، اسی کے لئے تھی اس پتھر دل جنونی شخص کے
لئے، جو خود لوگوں کے لئے عذاب بنا ہوا تھا وہ بھلا اس قابل کہاں تھا کہ کوئی اس سے پیار کرتا
اس کی تکلیف پر آنسو بہاتا۔

”تم بہت اچھے ہو سعنان..... معلوم ہے مجھے کہ بہت پیار کرتے ہو مجھ سے مگر
ضروری تو نہیں کہ اس پیار کے لئے تم خود کو مٹا ڈالو، کیوں اپنی آنکھیں پتھر کر ڈالی ہیں تم
نے.....؟ کبھی تو اپنے زخموں پر آنسو بہاؤ سعنان کبھی تو میرے کندھے پر سر رکھ کر اپنے دل کا
بوجھ ہلکا کرو، پلیز.....“

اس وقت جو آنسو انزلہ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ ان کی کک اپنی روح میں
اترتی محسوس کر رہا تھا، تبھی شاید دھیرے سے رخ پھیر کر اس نے اپنی پلکیں موندی تھیں۔

”اوکے..... مگر میں تمہیں اب ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے دوں گی سعنان، میں تم
سے تمہارا اپنا پن چھین لوں گی، پاگل کر دوں گی میں تمہیں تم صرف مجھے چاہو گے مجھے سوچو گے

میں تمہیں سنی دادا سے سنعان شاہد بنا کر رہوں گی سنعان اب بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دکھانا مجھ سے، بڑا گھمنڈ ہے ناں تمہیں اپنی طاقت پر اپنی غنڈہ گردی پر تم دیکھنا بہت جلد وہ دن آئے گا کہ تم اپنی ساری طاقت سارے گھمنڈ کے باوجود سسک سسک کر مجھ سے میری محبت مانگو گے مجھ جیسی کمزوری لڑکی سے ہارو گے اور تب کوئی ایک لمحہ بھی تمہارے اختیار میں نہیں ہوگا۔“

اپنی بیگی پلکیں رگڑتے، قطعی سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے وہ سنعان کے پاس سے اٹھی تھی اس نے فوراً چہرہ پھیر کر اس کی سمت نگاہ کی پھر دل میں نجانے کیا آیا کہ آنسو ضبط کرتے ہوئے آہستہ سے اس کا آنچل تھام کر اسے روک لیا۔

☆☆☆

زندگی کے میلے میں، خواہشوں کے ریلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھیلے میں
وقت کی رانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زبانی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں تخت اور تختے کی، ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گوذرا سی ہے، بات عمر بھر کی ہے
عمر بھر کی باتیں کب، دو گھڑی میں ہوتی ہیں
درد کے سمندر میں
ان گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں
آنکھ کے جزیرے میں، تم نے جو سجایا تھا
بات اس دیے کی ہے، بات اس گلے کی ہے
جوابوں کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے
لفظ کی فصلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
زندگی سے لمبی یہ، بات رنجبکی ہے
راستے میں کیا کہیں، بات تخیل کی ہے
تخیل کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے
پیار کرنے والوں کو ایک نگاہ کافی ہے

ہو سکتے تو سن جاؤ، ایک دن اکیلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھیلے میں

”م..... میری گڑیا بچ تو جائے گی ناں، اسے..... اسے کچھ ہوگا تو نہیں ناں؟“

شانزل ساکت کھڑا تھا جب وہ اگلے ہی پل اس کے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے
نم لہجے میں بولی، جواب میں وہ اپنی اودھم مچاتی دھڑکنوں پر بمشکل کنٹرول پاتے ہوئے شکستہ
لہجے میں بولا۔

”گڑیا کو کچھ نہیں ہوگا سبوعین..... تم سنبھالو پلیز خود کو۔“

سبوعین نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا بس خاموشی سے آنسو پونچھ کر سائیڈ
پر بیٹھ گئی تھی، تبھی وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بڑے بڑے قدم اٹھاتا خود بھی وہاں سے ڈاکٹر خالد
رحمن کے پاس چلا آیا جو کبھی گڑیا کا چیک اپ کر رہے تھے بچی کو سردی لگی تھی جس کے باعث
بخار ہوا تھا۔

رات کے پچھلے پہر کہیں فیصل شہزاد احمر کی واپسی ہوئی تو وہ لوگ گڑیا کو گھر واپس لا
چکے تھے۔ سبوعین اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی، جب کہ شانزل کچھ دیر وہاں
ٹھہرنے کے بعد اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ آنکھیں تھکن سے جل رہی تھیں مگر وجود اب بھی
سبوعین الہدیٰ کی قربت کے تصور سے مہک رہا تھا۔ پوچھنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی جب اچانک
اس نے فیصل کے دھاڑنے کی تیز آواز سنی غالباً نہیں وہ سبوعین الہدیٰ پر چلا رہا تھا۔

”ذلیل عورت..... اچھی طرح جانتا ہوں میں تم مجھے اور میری بیٹی کو مارنا چاہتی ہو،
دشمن ہو ہماری خوشیوں اور زندگی کی تم نے جان بوجھ کر گڑیا پر توجہ نہیں دی اس لئے اس کی
حالت زیادہ بگڑی پتہ نہیں کیسی منہوس گھڑی تھی جب تم میری زندگی کا حصہ بنیں۔“

زہر میں بجھے اس کے الفاظ شانزل علی شاہ کا سکون غارت کر گئے تھے گڑیا کے لئے
سبوعین کا محبت اور اس کی مخلصی کا وہ خود گواہ تھا وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر کتنی بے ساختگی کے
عالم میں روئی تھی مگر کتنی عجیب بے بسی تھی کہ وہ بات فی الحال فیصل شہزاد احمر کو نہیں بتا سکتا تھا۔

”منہوس عورت برباد کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے جب سے میری زندگی میں آئی ہو
لکھ پتی سے لکھ پتی ہو کر رہ گیا ہوں میں، جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے اپنی منہوس
صورت نہ دکھانا۔“

شانزل علی شاہ کے ضبط کے طنائیں یہاں ٹوٹ گئی تھیں شاید اشتعال کے عالم میں

بستر سے نکل کر وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اس کے وسیع گھر کی خاموش فضا میں سبعین الہدی کی دلخراش چیخ اور دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز گونج اور وہ جیسے ٹھٹھک کر گم حواس کے ساتھ وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

سنعان علی شاہد ہاسٹل سے ڈسچارج ہو چکا تھا اور اُس وقت وہ دونوں ندی کنارے بیٹھے تھے جب سعنان نے کھوئے لہجے میں کچھ یاد کرتے ہوئے اُسے بتایا۔

”جب میں یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹا تو بہت مسرور تھا انزلہ، اس ملک کے ہزاروں نوجوانوں کی مانند، میری آنکھوں میں بھی مستقبل کے بہت سے حسین خواب تھے، بہت خوش حال گھرانہ تھا ہمارا، پاپا جی، بڑے بھیا، چھوٹے بھیا، میں، ماما جی، دادی ماں اور ہم سب کی لاڈلی، میری اٹھارہ سالہ چھوٹی بہن یعنی سب مل جل کر، گویا ایک چھوٹی سی جنت میں رہا کرتے تھے۔“

”میں یونیورسٹی سے چھٹی پر، جب بھی گھر آتا۔ گویا جشن کا سماں برپا ہو جایا کرتا تھا، دادی ماں کی گود میں لیٹ کر، میں اپنے لمبے سفر کی تکان اتارتا اور پھر رات کو دیر تک ہم بہن بھائیوں کی دلچسپ محفل جیتی، بہت خوبصورت دن تھے وہ انزلہ لگتا ہی نہیں تھا کہ بہت جلد وہ ہاتھ سے گیلی ریت کی مانند پھسل کر بکھر جائیں گے۔“

سبک روی سے بہتی ندی کے شفاف پانی پر نگاہیں ٹکائے وہ قطعی گم سم سے لہجے میں اسے اپنی داستان سنارہا تھا اور اُدھر انزلہ شاہ اس کے پہلو میں بیٹھی مکمل انہماک سے اس کے گداز ہونٹوں کو اوپر تلے مسلسل حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”گاؤں میں میرے تین دوست تھے، جاوید، اظہر اور ثاقب، ہم تینوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر پاپا جی کو کبھی کبھی ہماری دوستی کھٹکنے لگتی تھی۔ میں جب بھی رات کو دیر سے گھر آتا وہ مجھ سے بری طرح الجھ پڑتے تھے۔ اکثر جاوید وغیرہ مجھے بلانے گھر آتے تو وہ ان کی طبیعت بھی اچھی طرح فریش کر دیا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی پاپا کی کسی بات کا برا نہیں مانا۔ جاوید تھوڑے سنجیدہ مزاج کا مالک تھا۔ وہ خوب پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ مگر اس کی غربت نے اس کے تمام خوابوں کو چکنا چور کر ڈالا باپ کے فالج کے بعد گھر کی تمام ذمہ داری اسی کے کندھوں پر آ پڑی تو اس نے تعلیم کو خیر آباد کہہ کر کھیتی باڑی کو جو ان کر لیا۔ جاوید کی نسبت اظہر اور ثاقب قدرے کھلنڈرے مزاج کے حامل تھے۔ گاؤں کی ہر خوبصورت

لڑکی سے چکر چلانا وہ اپنا ضرور فریضہ تصور کرتے تھے جب بھی میں یونیورسٹی سے گاؤں آتا میرے گھر والوں کے ساتھ ساتھ میرے دوستوں کی بھی گویا عید ہو جایا کرتی تھی۔ رات کو دیر تک گاؤں کے چوراہے پر بجلی والے کھمبے کی روشنی کے تلے بیٹھے ہم چاروں دوست اپنے اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کیا کرتے تھے۔ پورے گاؤں میں ہماری محبت اور دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جو بھی ہمیں ایک ساتھ نظر بھر کر دیکھتا تھا۔ بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ یقین مانو گاؤں کی اکثر لڑکیاں بہانے بہانے سے ہمارے گھروں میں صرف ہمارے دیدار کے لئے آیا کرتی تھیں۔“

انہیں دنوں تم میری زندگی میں آئیں اور میں جیسے تہا ہی منفرد سی شخصیت میں کھو کر اپنا آپ بھلا بیٹھا گاؤں آنے کو اب جیسے من ہی نہیں چاہتا تھا۔ دن رات عجیب سی بے قراری حواس پر چھائی رہتی تھی۔ گھر والوں اور یار دوستوں نے گلہ کیا تو مجھے اپنے دل کی روداد بیان کرنا دشوار ہو گیا۔ گھر میں ان دنوں بڑے بھیا کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ سب کے چہروں پر رقص کرنے والی خوشی کا عکس دیکھنے کے لائق تھا میں اگر ایک طرف بے حد مسرور تھا تو دوسری جانب تم سے بچھڑنے کا دکھ، میری جان پر بنا تھا۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب گاؤں واپس چلا جاؤں گا تو تمہیں کیسے دیکھوں گا؟ کیسے اپنے محلے دل کو قرار سوپیوں گا۔ ابھی یہی فکر اعصاب کو تھکا رہی تھی کہ اچانک میری زندگی میں بھونچال آ گیا۔ میں ان دنوں شہر میں تھا جب میرے چھوٹے بھیا نے مجھے فوراً گاؤں آنے کی اطلاع دی۔ قطعی بدحواسی کے عالم میں اپنا سب کچھ سمیٹ کر میں گاؤں آیا۔ تو سامنے ایک بہت بڑی قیامت میری منتظر تھی۔ میرے بڑے بھیا کہ جن کی شادی کے دن قریب تھے، جو ہم سب گھر والوں کو بے حد عزیز تھے۔ اسی میرے بڑے بھیا کو گاؤں کے چوہدری نے پانی کے معمولی تنازعے پر جان سے مار دیا۔“

سنعان شاہد کا لہجہ قدرے بھیگ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک کر گریاں میں جذب ہو گئے تھے، جب انزلہ شاہ نے اپنا موی ہاتھ آہستہ سے اس کے مضبوط ہاتھوں پر دھر دیا۔

”کاش میں تمہیں اس تکلیف کی تفصیل بتا سکتا انزلہ، جو اس وقت میں نے اور میرے گھر والوں نے اٹھائی تھی جس بھائی کی خوشیوں میں شریک ہونے کے خواب ہمیں مدھوش کر رہے تھے۔ میرا وہی بھائی ایک معمولی سے تنازعے کا شکار ہو کر موت کی بانہوں میں سو گیا۔ زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے یہ وہ ڈیرے کبھی نہیں جان سکتے۔ غم و غصے سے میرا خون جیسے

اس کے سوال پر سنعان شاہد کی خوبصورت آنکھوں کا اضطراب پھر قدرے بڑھ گیا تھا۔ تاہم کچھ پل خاموشی کی نذر کرنے کے بعد وہ افسردہ لہجے میں گویا ہوا۔

”چھوٹے بھیا اور ثاقب کو سزائے موت ہو گئی تھی۔ آخر گاؤں کے چوہدری کے بیٹے کی جان لی تھی انہوں نے قانون کیسے معاف کر دیتا انہیں، ایک سال کے اندر اندر وہ بھی چوہدری کے انتقام کی بھیٹ چڑھ گئے انزلہ، سب کچھ ختم ہو گیا میرے لئے رگوں میں دوڑتا تازگی کا احساس ختم ہو گیا ہے میرے لئے گواہ بھی پہلو میں دھڑکتا دل زندگی کا پتہ دیتا ہے، اب بھی یہ بصارتیں سب کچھ دیکھتی ہیں، سماعتوں نے ابھی کچھ بھی سننے سے انکار نہیں کیا ہے، لیکن..... لیکن میں مر چکا ہوں انزلہ، بے گور و کفن میرا وجود دفن ہو چکا ہے، کچھ باقی نہیں رہا کوئی مقصد نہیں رہا جیسے کا کہیں کچھ باقی نہیں رہا.....“

شدید مضطرب ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، جب انزلہ شاہ پھر سے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں سنی، لیکن۔“

”نہیں..... تم میرا درد نہیں سمجھ سکتیں، کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ سنی دادا کے درد کو دل میں سنبھال کر زندہ رہے جس کرب کا بار، میں نے اٹھا رکھا ہے کوئی اور اٹھائے تو ایک دن نہ زندہ رہ سکے۔“

شدید اذیت کے عالم میں، سرعت سے اس کی بات کاٹے ہوئے وہ پلٹا اٹھا تھا جب انزلہ نے کچھ پل خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد نگاہیں پھیر لیں۔

”چوہدری اور جاوید کا کیا ہوا سنی.....؟ اظہر کے ساتھ کیا ہوا.....؟“

آج وہ جیسے کچھ کرید لینا چاہتی تھی۔ تبھی وہ ضبط سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

”اظہر کو ایک سال قید کی سزا ہو گئی تھی، مگر وہ اپنی رہائی سے قبل ہی چوہدری کی خواہش پر ”پولیس مقابلے“ کا شکار ہو گیا۔“

اب کے اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ جنہیں اس نے سرعت سے رگڑ کر صاف کر ڈالا تھا۔

”پتہ ہے انزلہ..... جاوید کے ساتھ کیا ہوا؟“

خوبصورت بادامی نگاہیں دور نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں پر مرکوز کرتے ہوئے۔

اگلے ہی پل اس نے عجیب سے اداس لہجے میں پوچھا تھا، جواب میں سینے پر دونوں بازو

کھول اٹھا تھا۔ سامنے پڑے جوان بھائی کی لاش اور گھر والوں کا المناک بین میرے اعصاب شل کر رہا تھا، تبھی میں کسی کو بتائے بغیر سیدھا چوہدری کی حویلی میں گھس گیا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں چوہدری کے پورے خاندان کو ختم کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلا تھا۔ بالکل خالی ہاتھ مگر حویلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اپنے سلگتے اعصاب کے ساتھ نجانے کب تک میں وہاں رہا اور بالآخر شام ڈھلے جب چوہدری حویلی میں آیا تو میں اس پر پل پڑا شدید غصے کے باعث میری شریانیں جیسے پھٹ رہی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ چوہدری میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتا۔ اس کے آدمی وہاں چلے آئے اور یوں وہ میرے ہاتھوں سے زندہ بچ گیا۔ مجھے جیل ہو گئی تھی میں اپنے بڑے بھیا کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔ چوہدری نے مجھ پر نجانے کتنے مقدمات بنوائے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی رعایا کی خود پر ہاتھ اٹھانے والی جرأت کو فراموش نہیں کر سکا۔ اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے اس نے میری معصوم بہن پر ”بدکاری“ کی تہمت لگا کر اسے کاری قرار دے دیا۔ پورا گاؤں جانتا تھا کہ یہ ظلم ہے محض چوہدری کا انتقام ہے مگر کسی نے میری بہن کی پاکیزگی کی گواہی نہیں دی۔ دکھ محض یہ نہیں تھا کہ یمنی پر الزام لگا، شدید دکھ و اذیت کی بات تو یہ تھی کہ اس سازش میں میرے سب سے قریبی پیارے دوست جاوید کو بھی ملوث کر لیا گیا تھا۔ اس جاوید کو مجھ سے زیادہ یمنی کا خیال رکھتا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں پل کر وہ شعور تک پہنچی تھی۔ ہر طرف جیسے آگ دہک اٹھی تھی۔ میرے دوست اور چھوٹے بھیا چوہدری سے اس ظلم کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر اس کمینے نے میرے گھر میں آگ لگوا دی اس کتے نے اور اس آگ میں سب کچھ جل کر رہا کہ ہو گیا انزلہ، سب کچھ جل گیا.....“

”جو درد میرے اندر پڑا وہ ڈالے بیٹھا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں انزلہ، تم نے وہ دن نہیں دیکھے جو میں نے دیکھے ہیں تم نے اس کرب کا سامنا نہیں کیا جو میرے دل کو پتھر بنا گیا ہے کاش تم میری آنکھوں سے بہتے وہ آنسو دیکھ سکتیں انزلہ۔ جو میں نے اپنا سب کچھ لٹ جانے کے درد میں تڑپ تڑپ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بہائے تھے۔ کاش تم شہروں میں رہنے والے کبھی ہمارے جیسے گاؤں میں بسنے والے دیہاتیوں کی زندگی کے بارے میں جان سکتے کاش.....“

سرد آہ خشک فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا تھا۔ جب انزلہ نے دھیمے افسردہ لہجے میں زمین کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”چھوٹے بھیا کا کیا بناسی.....؟ اظہر اور ثاقب وغیرہ کہاں ہیں.....؟“

باندھے کھڑی۔ گم سم سی انزلہ شاہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”یعنی کے ساتھ اسے بھی گناہ گار قرار دینے کے بعد چوہدری کے آدمیوں نے اسے اغواء کر کے حویلی کے پچھواڑے میں زنجیروں سے باندھ دیا تھا، پورے چھ ماہ وہ وہیں بندھا رہا۔ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی موت کی اذیت سہتا، ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر بالآخر زندگی سے دور ہو گئی۔“

اب کے وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں پایا تھا، جواب میں انزلہ شاہ کا دل جیسے ہزار ٹکڑوں میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا۔

”میری آنکھوں میں اڑتی گزرے دنوں کی دھول کو دیکھو انزلہ اور جان لو کہ تمہارا سنعان علی شاہ ایک پڑھے لکھے مہذب انسان سے سنی دادا کیوں بنا.....؟ کیوں چوہدری کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے اس نے قلم کا ساتھ چھوڑ کر بندوق کو ہاتھ میں تھا، تم اُن لمحوں کے کرب کو کبھی نہیں جان سکتیں جو میرے دل میں پڑاؤ ڈال کر مجھ سے زندگی کا احساس چھین گئے ہیں۔“

اس کی آنکھ سے بہتا ایک ایک آنسو انزلہ کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا، تبھی اس نے آگے بڑھ کر ان آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چرن لیا۔

”کبھی شام میں اس چوراہے کے بین سنو انزلہ جہاں کبھی ہم چاروں دوست مل کر اپنے اپنے دل کا احوال ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے، دیکھو اب گاؤں کی گلیاں کتنی سنسان دکھائی دیتی ہیں، تم نہیں دیکھ سکتیں، مگر میں..... میں اب بھی اپنے یاروں کو ہنستے کھیلتے ان گلیوں میں پھرتے ہوئے دیکھتا ہوں، کبھی گاؤں کے اس چوراہے پر پرانے کونوئیں کے پاس پگھٹ پر روتے ہوئے دیکھتا ہوں تو لمحے سے قلم مر جانے کو دل چاہتا ہے انزلہ، شرمندگی ہوتی ہے اپنے جینے پر، صرف میری وجہ سے میرے یار اپنی زندگی گنوا بیٹھے انزلہ، صرف میری وجہ سے ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا، صرف میری وجہ سے۔“

وہ ہسٹریک ہو رہا تھا، جب انزلہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے مضبوط شانے پر رکھ دیا۔

”خود کو الزام مت دو سنعان جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“
”تو پھر کس کا قصور ہے انزلہ۔“ قطعی غڈ حال لہجے میں اس نے پوچھا تھا جب سہ پاٹ لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”پتہ نہیں..... دیہاتوں میں زندہ انسانوں کی زندگیاں جتنی تلخ ہیں۔ ان تلخیوں سے نقاب اٹھانے کی فرصت کسی کے پاس نہیں ہے سنی،..... پانی کا مسئلہ، جائیداد کا مسئلہ عزت کا مسئلہ، ان سب مسئلوں کے درمیان دیہی زندگی کتنی کریناک ہے۔ یہ شہروں میں بسنے والے لوگ نہیں جانتے، لیکن احساس سب کو ہے سنی برائی کو برائی سے ختم کرنے کی کوشش کریں تو یہ کبھی ختم نہیں ہوتی بڑھتی چلی جاتی ہے پھیلی چلی جاتی ہے تم پڑھے لکھے تھے سمجھدار تھے تمہیں سمجھداری سے کام لے کر اس مسئلے کو سلجھانا چاہیے تھا۔“

بہت دھیمے لہجے میں اس نے سمجھانا چاہا تھا، جب وہ شدید مشتعل ہو کر واپس پلٹا۔
”کیسی سمجھداری..... کس سمجھداری کی بات کر رہی ہو تم..... بولو..... کیا اپنے بڑے بھیا کی موت کو چپ چاپ قبول کر کے چوہدری کو معاف کر دیتا، چوڑیاں بہن کر بیٹھ جاتا، بزدل تھا میں کوئی جو اس کے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھاتا بولو، کیا کرتا میں.....؟“
”تمہیں قانون خود ہاتھ میں لینے کی بجائے اس کا سہارا لینا چاہیے تھا سنی۔“

”ہاں..... تم جیسے پڑھے لکھے شہریوں سے ایسی باتیں ہی سننے کو مل سکتی ہیں، سامنے جوان بھائی کی خون میں نہائی لاش پڑی ہو، اور میں بزدلوں کی طرح پولیس والوں کی منتیں کرتا پھرتا کہ وہ مجھے انصاف دلائیں، سوری مس انزلہ مگر آپ شاید اپنے ملک کے قانون سے واقف نہیں ہیں، یہاں انصاف صرف پیسے والوں کو ملتا ہے کسی غریب کی صدا پر کوئی کان نہیں دھرتا یہاں، میں قانون کے پاس دھکے کھاتا اور ادھر چوہدری تمہارے ”قانون“ کی مٹھی گرم کر کے اس معاملے کو سیدھا خود کشی کا کیس بنا دیتا سارے گاؤں والے اسی کے حق میں گواہی دیتے۔ بولو..... تب میں کیا کرتا.....؟ میرے جوان بھائی کو موت کی نیند سلانے والا چوہدری میری آنکھوں کے سامنے دندنا ہوا پھرتا اور میں بے بسی کا اشتہار بنا اس کا منہ دیکھتا رہتا، یہی تہذیب ہے تو ایسی تہذیب و مہذب پن پر سو بار لعنت بھیجتا ہوں میں.....“

وہ جو بھی کہہ رہا تھا کہ اس میں کچھ غلط نہیں تھا، تبھی انزلہ شاہ نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے گفتگو کا رخ پھیر دیا۔

”اپنے پاپا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تم نے، کیا وہ بھی ماں جی کے ساتھ، تمہارے گھر میں لگنے والی آگ کی نذر ہو گئے۔“
وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے سوال پر ایک مرتبہ پھر سنعان علی شاہ کی آنکھوں کا اضطراب بڑھا تھا۔ تاہم وہ خاصی مضبوطی سے فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے لہجے میں بولا۔

صد پر کان نہیں دھرنے گا۔ وہی آپ کی گورنمنٹ جو لاکھوں لوگوں کی موجودگی میں آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر آپ کو میڈل سے نوازتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے وہی اکیلے میں آپ کو دوبارہ پہچاننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتی.....“ بہت زیادہ تلخی بھری ہوئی تھی اس کے اندر انزلہ نے اس وقت خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”ایلیان جفری سے کیا دشمنی تھی تمہاری.....؟ اسے کیوں موت کی بے رحم بانہوں میں دھکیل دیا تم نے؟“

بہت دیر کے بعد اس نے پوچھنے کی جسارت کی تھی جواب میں وہ کچھ پل خاموشی کی نذر کرنے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔

”میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے اسے نہیں مارا۔“

”ہاں یاد ہے مجھے لیکن اسے پولیس کے حوالے تو تم نے ہی کیا تھا۔“

”بے شک ایسا ہوا تھا، لیکن اس میں بھی اسی کا قصور تھا۔“

”کیا قصور تھا اس کا..... یہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس انزلہ شاہ سے جسے تم

پیار کرتے تھے۔“

اپنے خیال میں اس نے خاصی گہری چوٹ کی تھی اس پر مگر جواب میں ایک دھیمی سی مسکان اس کے لبوں پر نکھر کر رہ گئی تھی۔

”پیار کرتا تھا نہیں پیار کرتا ہوں۔ میں نے تو اپنے سارے خوشگوار دنوں کو دفن کر دیا

تھا سو چاہی نہیں تھا کہ زندگی میں دوبارہ یوں تم سے سامنا ہو جائے گا.....“

”مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے سہان۔ سہرے لحوں کا ذکر چھیڑ کر تم مجھے ٹالنے

کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔“ لمحے سے قبل اس کی بات کانتے ہوئے اس نے کہا تھا جواب میں

وہ لب بھینچ کر پھر سے آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولا۔

”ایلیان سے میری کوئی دشمنی تھی انزلہ ہاں میں اس سے جھگڑا تھا۔ تمہیں اس کے

قریب دیکھ کر اس کے ساتھ آتے جاتے ہنستے بولتے دیکھ کر اندر ہی اندر کھولتا رہتا تھا میں لیکن

اسے زندگی سے دور کر دینے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے۔“

چند لمحوں کے لئے وہ پھر سے سانس لینے کو رکھا تھا تاہم انزلہ اب بھی بغور اس کے

چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے انزلہ پہچانیں کب کیسے اور کیوں اسی گاؤں

”نہیں..... نہیں اظہر نے جلتے ہوئے مکان سے زندہ باہر نکال لیا تھا جوان بیٹوں کی موت اور ہنستے ہنستے گھر کی بربادی نے ان کی ساری ہمت ختم کر ڈالی تھی۔ چند ہی دنوں میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے تھے وہ بالکل بستر سے لگ کر رہ گئے تھے۔ اظہر نے ان کا بہت خیال رکھا میں جب رہا ہو کر آیا، تو گویا وہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں جو آنسو بچل رہے تھے۔ ان آنسوؤں کا کرب میں نے آج تک کسی آنکھ میں نہیں دیکھا انزلہ..... کبھی نہیں دیکھا.....“

ایک مرتبہ پھر اس کا لہجہ بھرا گیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ اس وقت ضبط کے شدید کڑے مراحل سے گزر رہا ہو۔

”ملک کی بات کرتی ہو تم، انسانیت اور محبت کی بات کرتی ہو ہمارا آزاد ملک کہاں ہے انزلہ کہاں ہے وہ انسانیت و محبت جو اپنے مسلمان بھائی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھے تم نہیں جان سکتیں۔ تم کبھی ان لحوں کا کرب نہیں سمجھ سکتیں جب میں اپنے نحیف و لاغر بابا کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر بھاگتے ہوئے ہسپتال پہنچا تھا۔ اس وقت میرے لئے بابا کی زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ آخری زندہ فک جانے والے رشتے کی سلامتی کے لئے میں ننگے پاؤں ہسپتال میں یہاں سے وہاں بے بسی کا اشتہار بنا بھاگتا پھر رہا تھا..... مگر تمہارے ملک کے کسی میخانے میری مدد نہیں کی میرے بابا کی حالت بہت سرسب تھی ان کے جگر میں بننے والے زخم اب رسنے لگے تھے فوری آپریشن سے ان کی زندگی بچ سکتی تھی مگر ان کا آپریشن نہیں کیا گیا۔ محض چند دولت کے سکوں کے عوض تمہارے ملک کے میخاؤں نے اپنا وقار گرا دیا اور میرے بابا.....

میرے بابا میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر ابدی نیند سو گئے انزلہ کس آزاد وطن کی بات کرتی ہو.....؟ کون مہذب ہے تمہارے اس آزاد وطن میں؟ کتابیں چاٹ چاٹ کر بھی کون انسانیت کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو پایا ہے؟ ڈاکٹر، وکیل، پولیس، جج..... سب پیسے کے طلب گار ہیں، زندگی محض دولت کے سکوں کی مرہون منت ہو کر رہ گئی ہے، سرکاری ہسپتال ہو یا پرائیویٹ پیسے کے بغیر زندگی کا حصول ممکن نہیں ہے، خواہ آپ کے پیارے آپ کی آنکھوں کے سامنے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مارجائیں تمہارے اس آزاد وطن کے میخاؤں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مردہ ہو چکے ہیں ان کے ضمیر..... پیسے ہاتھ میں لے کر جاؤ..... تو تمہارے آزاد وطن کا ”قانون“ تمہاری بات سننے کا نہیں تو دھکے مار کر باہر نکال دے گا، خواہ آپ انصاف کے حصول کے لئے چلاتے رہیں، صدائیں دیتے رہیں، یہاں آپ کو مفلس دیکھ کر کوئی آپ کی

رفیق حسین کی بیٹی مجھ پر فدا ہو گئی میرے پاس تو تم سے ہٹ کر کسی اور کے بارے میں سوچنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ میں کیسے اس کی حوصلہ افزائی کر دیتا۔ کیسے اس کے جذبوں کو خراج تحسین بخش کر اسے سہانے خواب سوپ دیتا جب کہ میں..... میں تو سنعان علی شاہ بھی نہیں رہا تھا۔“

قطعی کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ اسے گزرے دنوں کی روداد سنارہا تھا اور انزلہ شاہ مکمل انہماک سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

محبت کب سمجھتی ہے

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی دشت وحشت ہے

جو خوابوں میں بسی آنکھوں کو، جانے کب کہاں اجاڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ یہ جو سانپ سا اندر ہی اندر ہانپتا ہے

سانس لیتا ہے

نجانے کب کہاں یہ کون سی معصوم خواہش کو

یونہی جھنجھوڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ جو شفاف رستے ہیں

در منزل پہ رکتے ہیں

تھکن..... تھک نہیں دیں گے

کہیں بھٹکا نہیں دیں گے

محبت کب سمجھتی ہے کہ ان شفاف رستوں سے

کوئی دکھ درد کی جانب اسے نہ موڑ ڈالے گا

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی توڑ ڈالے گا

زویا خان کی مہراہی میں وہ گھر کی دہلیز تک پہنچا تو سامنے ایک اور ہی طوفان شدت

سے اس کا منتظر تھا ابھی کچھ ہی لمحے قبل جو اطمینان جو مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں تھی گھر پر قدم رکھتے ہی وہ اطمینان وہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے رخصت ہو چکی تھی۔

سر سبز لان کراس کر کے وہ وسیع ہال میں پہنچا، تو نظروں کے سامنے ہی تنہی گڑیا بلک

بلک کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی اور اس کے قریب وہ اس کی ”دشمن جاں“

بے حس و حرکت زمین پر پڑی، ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا

دل سینے میں بری طرح سے دھڑکا تھا، مگر اگلے ہی پل وہ بجلی کی سرعت سے لپک کر اس کے قریب جا پہنچا تھا۔ زویا خان اور تنہی گڑیا کی موجودگی کو اس وقت اس نے یکسر فراموش کر دیا تھا۔

”سبعین..... سبعین آنکھیں کھولو پلیز۔“

کس درجہ بے قراری کے ساتھ ایک ساتھ میں اس کے رخ ٹھنڈے ہاتھ تھام کر دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور ادھر ایک درد کی لہر سرعت کے ساتھ زویا خان کے پورے وجود میں چپکے سے سرایت کر گئی تھی۔

”تم کہتے ہو کہ تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے.....؟ کہاں تک خود کو دھوکے میں رکھو گے شانزل.....؟ کہاں تک محبت کے احساس دل بچاؤ گے اپنا۔ خاصی طنز یہ مسکراہٹ اس وقت زویا خان کے لبوں پر بکھری تھی مگر اگلے ہی پل اس نے سرعت سے سر جھٹک کر جیسے ہر احساس سے دامن چھڑا لیا تھا۔

”آپ مجھے کچھ اپیشل دکھانا چاہتے تھے شانزل۔“ ضبط سے ہونٹ کاٹتے ہوئے صبر کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اس کے قریب آ بیٹھی تھی جواب میں بدحواس سے شانزل علی شاہ نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا گویا اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں، آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بات بے بات پر بے ہوش ہو جانا سبعین صاحبہ نے تو اپنا شیوہ بنا لیا ہے، آپ کب تک ان کے لئے اپنا خون جلاتے پھریں گے، ویسے بھی ان کا خیال رکھنے کی ذمہ داری ان کے ہر بینڈ کی ہے۔“

وہ دل کی ہرگز بری نہیں تھی، مگر اس وقت جو آگ شانزل کو اس کے لئے متشکر دیکھ کر اس پر حد درجہ مہربان دیکھ کر سینے میں جل اٹھی تھی اس آگ کی تپش نے اس کا لہجہ اتنا تلخ بنا دیا تھا۔ تاہم شانزل علی شاہ نے اس کے الفاظ پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔

”میں سبعین کے لئے ایسے الفاظ قطعی پسند نہیں کرتا زویا، آئندہ میں ایسے الفاظ،

آپ کے منہ سے کبھی نہ سنوں۔“

”کیوں..... جب آپ کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، جب آپ اس سے محبت کے دعویٰ دار ہی نہیں ہیں پھر اس کے لئے آپ کی یہ فکر یہ تڑپ کیوں..... کسی ایک سائڈ پر کیوں نہیں لگ جاتے آپ۔“

وہ ایموشنل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ایموشنل ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جواب میں

ازحد ڈسٹرب شانزل علی شاہ نے قطعی بے نیازی کے عالم میں اس کی طرف سے نگاہیں پھیرتے

سے رخصت ہوتے دیکھ کر اسے خاصا دکھ ہوا تھا مگر اس دکھ پر اس وقت سبعین الہدیٰ کی فکر قدرے بھاری تھی وہ سر جھٹک کر اس کی طرف پھر متوجہ ہوا تھا۔

شدید بخار میں جلتا وجود دیکھ کر بے رونق بال اور لٹھے کے مانند سفید پڑا چہرہ اس کی جان پر بنا ہوا تھا، ”کیا ہوا ہوگا.....؟“ اس کا سوال رہ رہ کر اسے الجھا رہا تھا عین اسی بل اس کی توجہ اس چھوٹی سی بچی پر پڑی تھی جو رو رو کر اپنا حال برا کر رہی تھی۔

”گڑیا..... رو کیوں رہی ہو بیٹا، ماما کو کچھ نہیں ہوا ہے۔“

اس ننھی بچی سے زیادہ اس نے خود اپنے دل کو تسلی دی تھی، جب اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بتایا۔

”پاپا نے ماما کو بہت مارا ہے انکل..... پاپا ماما سے پیسے بھی چھین کر لے گئے ہیں۔“
ننھی بچی کی اطلاع پر اذیت کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود سے سرایت کر گئی تھی۔

”پاپا کہاں ہیں اس وقت؟“ موٹی موٹی غلانی آنکھوں میں لمحے سے قبل خون اتر آیا تھا، جب بچی روتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”پتہ نہیں..... میں ابھی سکول سے آئی تھی، پاپا ماما سے جھگڑ رہے تھے، ماما کے بال پاپا کے ہاتھوں میں تھے۔ ایک عورت بھی ان کے ساتھ تھی۔ میں نے ماما کے ہونٹوں سے خون نکلتے دیکھا تھا، پاپا بہت بری طرح سے ماما کو مار رہے تھے۔“

ننھی بچی کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں جب اس نے اضطراب سے لب کاٹتے ہوئے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”میں پاپا سے نفرت کرتی ہوں انکل، آئی ہیٹ ہم.....“

شانزل علی شاہ کا سہارا پا کر بچی کے دل کا درد فوراً زبان پر آ گیا تھا، تبھی شانزل نے آہستہ سے اس کی پیشانی چوم کر بے ہوش پڑی سبعین الہدیٰ کو اپنی بانہوں میں اٹھایا تھا۔ لمبی پلکوں والی سوچھی ہوئی بند آنکھیں اس کے اضطراب میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے فیصل احمد نکل کر سامنے آئے اور وہ اپنے پستل کی ساری کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دے سبعین کو اپنے بیڈ روم میں اپنے بیڈ پر لٹاتے ہوئے وہ نفع و نقصان سے یکسر بے نیاز ہو چکا تھا کوٹ کی پاکٹ سے اپنا موبائل نکال کر، اپنے فیملی ڈاکٹر احسان علی کا نمبر پر لیں کرتے ہوئے اس کی مضبوط انگلیاں واضح کپکپا رہی تھیں۔ دل کا سارا

ہوئے بلند آواز میں اپنے ڈرائیور کو طلب کر لیا تھا۔

”جی صاحب.....“ دوڑ کر آتا ڈرائیور اگلے ہی لمحوں میں ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”نیگم صاحبہ کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آؤ ابھی۔“

زویا خان کے دل میں اس کے الفاظ تیر کی مانند چبھے تھے خوبصورت کٹھورہ سی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں قطعی بے دردی کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے شانزل علی شاہ پر آخری الوداعی نظر ڈالی تھی اور پھر سرعت سے اٹھ کر تقریباً بھاگتے ہوئے وسیع ہال سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

ابھی ٹھہرو ابھی کچھ دن لگیں گے

وصل کو خواہش بنانے میں

تمہیں اپنا سمجھنے کے لئے دل کو منانے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

وفا کیا ہے، تقاضائے محبت کی حدیں کیا ہیں؟

حدوں کی سرحدیں کیا ہیں؟

پھر ان کے پار جانے کا سبب کیا ہے؟

دھیان و بے دھیانی میں

تمہاری بھٹکتی باتوں کی ندیا کی روانی میں

کہانی ہی کہانی میں، اگر بے جادہ و منزل

اور..... خواہشوں کے بے بس، مہتاب چہروں کو

ابھی ٹھہرو، ابھی کچھ دن لگیں گے

رشتہ بے نام کو، ہم نام کرنے میں

کہانی کو کسی آغاز سے انجام کرنے میں

کہیں اظہار کرنے میں، کہیں اقرار کرنے میں

ابھی ٹھہرو، ابھی کچھ دن لگیں گے۔

آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہوں کا اضطراب چھلکاتی زویا خان کو یوں اس طرح

کا صدمہ لیا ہے اس سے انہیں نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا تھا، فی الحال میں آنکھیں لگا دیتا ہوں اور کچھ ٹیلیشن بھی لکھ دیتا ہوں، اللہ نے چاہا تو انہیں جلد ہوش آجائے گا۔“

ڈاکٹر احسان علی کی پیشین گوئی نے اسے مزید الجھا دیا تھا۔ بھلا سببیں کو ایسا صدمہ کیونکہ پیش آ سکتا ہے کہ وہ ہوش حواس سے ہی بیگانہ ہو جائے ایسا کیا کہا ہو گا فیصلہ امر نے اس سے؟ آخر ان دونوں کے مابین کیا بات ہوئی ہوگی؟ سوچ سوچ کر وہ الجھتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر احسان علی نے آنکھیں لگانے کے لئے اس کی قمیض کا بازو اوپر اٹھایا تو ان کے ساتھ شانزل بھی اس کے بازو پر پڑے گہرے نیل کے نشانات دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نازک سے بازو کی جلد پر ضربوں کے نشانات بڑے واضح تھے۔

وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا مگر اس لمحے اس کے دودھیا بازو پر لگے زخموں کے نشان اس کے دل کو ہزار ٹکڑوں میں تقسیم کر گئے تھے، کس قدر بے بسی کے ساتھ اس نے قریبی دیوار پر بھرپور مکا رسید کیا تھا۔

شام کے سیاہ دھندلے رات کی گھمبیر تاریکی میں ڈھل چکے تھے جب اس نے بمشکل اپنی لرزتی پلکیں وا کر کے ارد گرد کا جائزہ لیا تھا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ شانزل اس وقت نضحی گڑیا کے بیڈروم میں گھسا اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پریوں اور جنوں کی کہانی سنا کر اس نے بچی کے ننھے سے ذہن سے سببیں والی ٹینشن دور کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

نضحی گڑیا کو سلانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تو سببیں ارد گرد سے بے نیاز تکیے کے سہارے بیٹھی خوب زور و شور سے رونے میں مشغول تھی۔

”کیا میں آپ سے ان آنسوؤں کے بہنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں سببیں۔“
دروازہ کھلا چھوڑ کر ست قدموں سے چلتا ہوا وہ اس کے قریب آ بیٹھا تھا جب وہ سرعت سے اپنی آنکھیں رگڑ کر کہتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جو آنسو تم نے خود میری آنکھوں میں بھرے ہیں۔ اب اس کی وضاحت مجھ سے مانگ رہے ہو۔“

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے سببیں۔“ اس کی خاموش آنکھوں کے اضطراب میں قطعی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں، کیوں اپنے بیڈروم میں

اقرار ادا کر جیسے لبوں پر سٹ آیا تھا۔

لمحوں میں آنکھیں جیسے سلگنے لگیں تھیں، کس قدر دیوانگی سے وہ عجیب پیاسے انداز میں اس کے خشک لبوں کو دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے محبت نہیں کرتا، مگر پھر بھی تمہارا درد مجھے نڈھال کر دیتا ہے سببیں کس سے کہوں میں یہ بات کس کی آغوش میں سر رکھ کر میں تمہارے دل پر گرنے والے سارے آنسو اپنی آنکھوں سے بہا دوں۔“

بے ہوش پڑی سببیں الہدیٰ کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنائیت سے تھپتھپاتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں اس نے سرگوشی کی تھی، جب سببیں کے قریب آتی تھی گڑیا نے، عجیب یاسیت کے عالم میں اس سے سوال کیا۔

”انکل..... کیا میری ماما خوبصورت نہیں ہیں؟“
شانزل نے اس کے سوال پر قدرے چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”بتائیے ناں انکل..... کیا میری ماما خوبصورت نہیں ہیں۔“
اسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا، جب

وہ بغور سببیں الہدیٰ کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔
”آپ کی ماما سے زیادہ خوبصورت کون ہو سکتا ہے بیٹے یہ چہرہ، یہ سراپا، یہ شخصیت، تو ڈھونڈنے سے بھی کہیں دکھائی نہ دے۔“

”اگر ماما خوبصورت ہیں تو پاپا ان سے پیار کیوں نہیں کرتے انکل.....؟ ماما تو اتنی اچھی ہیں میرا اور پاپا کا بہت خیال رکھتی ہیں، پھر پاپا ان کو مارتے کیوں ہیں.....؟“

وہ اس نضحی پری کے اس معصوم سے سوال کا کیا جواب دیتا؟ کیا کہتا کہ تمہارے پاپا کو اس خوبصورت سراپے کی قدر نہیں ہے وہ ذہنی طور پر ایک اذیت پسند انسان ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچی کے اس معصوم سے سوال کے جواب میں کیا کہے؟ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ ڈاکٹر احسان علی وہاں چلے آئے۔

سببیں کی حالت میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی بے حس و حرکت پڑی مٹی کا بت دکھائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر احسان علی اس کا اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد شانزل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

”بظاہر خطرے والی کوئی بات نہیں ہے مگر جس شدت کے ساتھ مریضہ نے کسی بات

لے آئے ہو مجھے؟“ بھرپور شدت سے چلانے کی خواہش میں، وہ بری طرح ہانپ کر رہ گئی تھی۔
 ”فیصل سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی، پلیز بتاؤ مجھے۔“ اس کا نرم لہجہ اب بھی
 قدرے خشک تھا، جواباً وہ پھر سے چلا اٹھی۔

”کیوں بتاؤں تمہیں؟ تم ہوتے کون ہو میری پرسنل لائف میں انٹرفیر کرنے والے۔“
 ”سبعین..... اس وقت میں تم سے جو پوچھ رہا ہوں اسی کا جواب دو۔“

ایک لمحے میں اس کے چہرے کے تیور بدلے تھے، نرم لہجہ یکلخت ہی خاصا تلخ ہو کر
 رہ گیا تھا سبعین الہدیٰ نے قدرے چونک کر سہی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تنے
 ہوئے سرخ چہرے پر اس وقت سوائے کرسنگی کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی وہ
 دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر خاصی شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”وہ مجھے ڈائیووس دے کر کسی مالدار خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے، میں مر جاؤں
 گی مگر اپنی ذات پر مزید کوئی داغ لگنے نہیں دوں گی۔“

اس کی اطلاع واقعی قابل افسوس تھی، مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اس کا دل بجائے کسی
 دکھ کے احساس میں گھرنے سے ایک انجانی سی مسکت سے چل اٹھا تھا۔ گداز لبوں پر آپ ہی
 آپ لطیف سی مسکراہٹ ریگ گئی تھی۔

”یہ تو اچھی بات ہے سبعین کہ وہ جلا دھت انسان یوں آسانی سے تمہاری جان
 چھوڑ رہا ہے۔“ دل کی بات لبوں پر آئے بغیر رہ نہیں سکی تھی جواب میں سبعین الہدیٰ نے
 آنسوؤں بھری پرشکوہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اس سے جان چھڑانا نہیں چاہتی تھی کہ ایک اغوا شدہ لڑکی کے بعد اب اپنی
 ذات پر ایک طلاق یافتہ کا لیبل لگانا نہیں چاہتی تھی میں، نہیں سن سکتی میں دنیا والوں کے طنز۔“
 اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی، جواب میں شانزل علی شاہ بیڈ سے اٹھ کر لان میں کھلنے والی
 کھڑکی کی طرف چلا آیا۔

”دنیا والوں کی بہت پروا ہے تمہیں“ کبھی اپنے لئے بھی کچھ سوچ لیا کرو۔“ دونوں
 ہاتھ جینز کی پائٹس میں گھسائے اس نے خاصے مدہم لہجے میں کہا تھا، جب وہ اپنے گالوں پر
 ٹکھرنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”اپنے لئے سوچنے کا اختیار میں کھوپچکی ہوں۔“ سبعین کے درشت جواب کے بعد
 محض چند سیکنڈ وہ خاموش رہا تھا۔ پھر جانے کس رو میں بہہ کر پوچھ بیٹھا تم سے ایک سوال کر

دونوں ماسٹڈ تو نہیں کرو گی۔

”ماسٹڈ کیا ہوتا ہے مسٹر شانزل..... بہت دن ہوئے میں اپنے احساسات سے محروم
 ہو چکی ہوں۔“ اس کے اس درجہ تلخ جواب پر بے ساختہ وہ واپس پلٹ آیا تھا۔
 ”سچ بتانا سبعین..... کیا فیصل احر تمہیں تمہارا حق دے رہا ہے؟“

غلافی نگاہوں سے بغور اس کے چہرے کو سکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، جب وہ
 بے ساختہ گڑبڑا کر نکلا ہیں جھکا گئی، اس کا سوال اتنا گھمبیر نہیں تھا کہ وہ سمجھ نہ پائی، مگر اس وقت
 اس کے سوال کا سچ سچ جواب دینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا، تبھی وہ نظریں جھکائے خاموش
 بیٹھی رہی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے سبعین.....؟“

جانے وہ اپنے کون سے شک کا یقین چاہتا تھا، سبعین الہدیٰ کے لئے اس وقت اپنا
 بھرم رکھنا خاصا دشوار ہو رہا تھا تبھی شاید وہ سرد مہری سے رخ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔
 ”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔“

”نہ سہی، مگر، اتنا یقین تو مجھے ہے کہ تمہارے ہوش رہا سراپے کو، آسانی سے نظر انداز
 کر دینے کا حوصلہ تو فیصل شہزاد احر میں بھی نہیں ہو گا۔“

وہ بظاہر ہوش میں تھا، مگر اس کے الفاظ بہک رہے تھے۔ سبعین تپ اٹھی۔
 ”شٹ اپ مسٹر شانزل..... دنیا میں ہر شخص تمہاری طرح ہوس پرست نہیں ہے۔“ قطعی
 ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چلا اٹھی، جب وہ سنجیدگی سے لب بھینچتے ہوئے بولا۔

”میں نے کیا ہوس پرستی دکھائی ہے.....؟ تم تو میری پارسائی کی گواہ ہو..... کوئی
 جانے نہ جانے تم تو جانتی ہو کہ میں نے تمہیں پورے بیس دن اپنی حراست میں رکھ کر بھی
 شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بہر حال، فیصل کہاں گیا ہے اس وقت۔“
 ”مجھے نہیں معلوم اسے کہیں بھی جانا ہو وہ مجھے بتا کر نہیں جاتا۔“ تلخی سے کہنے کے

ساتھ ہی وہ قدرے ہمت کر کے اس کے جہازی سائز بیڈ سے نیچے اتر آئی۔
 ”کہاں جا رہی ہو سبعین.....؟ تمہاری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔“ اسے بیڈ سے
 اترتے دیکھ کر سرعت سے پیچھے پلٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، جب وہ قدرے ترش لہجے میں بولی۔
 ”میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں مسٹر شانزل، آپ کو میرے لئے زیادہ فکر مند ہونے
 کی ضرورت نہیں ہے۔“

”سبعین تم..... سرعت سے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا، جب وہ تیزی سے پلٹ کر سر دنگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”مجھے تمہاری ہمدردیوں کی بھیک نہیں چاہیے..... کیوں بار بار میرا ضبط آزمانے کے لئے میرے سامنے چلے آتے ہو خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ شانزل تمہیں سب سے عزیز رشتے کا واسطہ پاکستان سے چلے جاؤ پلیز۔“

ترشی سے کہتے ہوئے وہ جیسے ٹوٹ گئی تھی، ہزار ضبط کی کوشش میں بھی آنکھیں لبا لب پانیوں سے بھر آئی تھیں جواب میں اس نے آہستگی سے رخ پھیرتے ہوئے کس درجہ اذیت کے عالم میں اپنے ہونٹ کو کاٹا تھا۔

”چلا جاؤں گا بہت جلد چلا جاؤں گا، لیکن تم اپنا خیال رکھا کرو پلیز۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کرے سے باہر نکل آیا تھا۔

شب کے تقریباً ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ باہر موسم میں خاصی خشکی کا احساس پھیلا ہوا تھا۔ مگر اس کا ذہن اس وقت سن ہو رہا تھا۔ اعصاب بے حد بو جھل محسوس ہو رہے تھے۔ قطعی بے دلی کے ساتھ، ڈرائیونگ سیٹ، سنبھال کر اس نے گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے معطر جھونکے سلگتی آنکھوں کے لئے خاصے مفید ثابت ہو رہے تھے۔ وہ اس کی فکر میں گھلنا نہیں چاہتا تھا، مگر گھل رہا تھا، اسے ایک لمحے کے لئے بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا، مگر ہر لمحے اس کی سوچ، ذہن میں انک کر رہ گئی تھی، وہ جتنا اس کے تصور سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اتنا ہی اس کی ذات کے کنجیل میں الجھتا جا رہا تھا۔ زندگی میں ایسی صورت الحال تو کبھی پیش نہیں آئی تھی اسے کہ وہ دل و دماغ سے اپنا اختیار کھو بیٹھا ہو۔ آج تک اس نے خود کو خاصا سنبھال کر اپنے کنٹرول میں کیا تھا، مگر اب سبعین الہدیٰ کے معاملے میں وہ خود کو قطعی بے بس تصور کر رہا تھا۔

ہانگ کانگ کے لئے اس کی سیٹ اوکے ہو چکی تھی۔ سبعین الہدیٰ کے سحر سے نکلنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا اس کے پاس لہذا وہ سنجیدگی سے آج کل جانے کے لئے تیاری میں مشغول تھا، دھیرے دھیرے سرکٹی اس خشک رات کے یہ اداس لمحے اُسے بہت بے کل کر رہے تھے۔ قریبی میڈیکل سٹور سے سبعین الہدیٰ کے لئے میڈیسن خریدنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی کا رخ زویا خان آفندی کے گھر کی جانب موڑ دیا تھا، وہ ایک لڑکی جو اس کی ذات سے بے حد مخلص تھی، آج انجانے میں وہ اسے شدید ہرٹ کر بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ زویا اس سے شدید خفا ہو گئی تھی اسے منانے کے لئے اس نے فوری شادی کا فیصلہ ذہن میں ترتیب دے لیا تھا۔ بننے بکھرنے کے اس کھیل سے وہ خود بھی خاصا اکتا چکا تھا۔ لہذا ہانگ کانگ روانگی سے قبل، وہ خود کو زویا خان آفندی کے سپرد کر دینا چاہتا تھا مگر دل اس فیصلے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زویا خان آفندی کا ساتھ، اس کے دلی اضطراب کو کم نہیں کرے گا، مگر پھر بھی وہ اب کسی ایک کنارے کی طرف لگ جانا چاہتا تھا۔ لہذا یہی سوچ کر اس نے اپنی گاڑی کو عین اس کے گھر کے سیاہ گیٹ کے سامنے روک دیا تھا۔

☆☆☆

کیوں جاگتے ہو، کیوں سوچتے ہو

کچھ ہم سے کہو، تنہا نہ رہو

خلوت کے خرابے میں ہم بھی، اتنے ہی پریشان رہتے ہیں

اس خواب و خیال کی بستی میں

مجبور و پشیمان رہتے ہیں

سوچا نہ کرو

یادوں کے برستے بادلوں کو، پلکوں پہ سجانا ٹھیک نہیں

جو اپنے بس کی بات نہ ہو، اس کو دہرانا ٹھیک نہیں

ایسے نہ کرید و زخموں کو

ایسے تو نہ میری جان کرو.....

مجھ پر اتنا احسان کرو

اب رات کی آنکھیں بھیگ چلیں

اور چاند بھی چھپ جانے کو

کچھ دیر میں شبنم آئے گی، پھولوں کی پیاس بجھانے کو

شاداب شگوفوں کی مانند، خوابوں کے نگر میں کھو جاؤ

اب سو جاؤ، تم سو جاؤ.....

موٹی موٹی بادامی آنکھوں اور بھاری مونچھوں تلے دبے گداز لبوں والا وہ شخص اس وقت

اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑا، جیسے مکمل طور پر ماضی کے دھندلکوں میں گم دکھائی دے رہا تھا۔

”رشید چاچا اور رفیق چاچا کی آپس میں گہری دوستی تھی انزلہ اس لئے ان دونوں

نے اپنے بچوں کے بچپن میں ہی ان کی نسبت طے کر دی تھی رشید چاچا کا بیٹا ساجد حسین ایلان کا یا رتھا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی منگیت یعنی رفیق چاچا کی بیٹی پر دل جان سے عاشق ہے ان دنوں میں جیل سے رہا ہو کر آیا ہی تھا۔ سوائے بڑی ماں کے میرے پاس اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ لہذا میں دن رات چوہدری کے پورے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے پلان بنا رہا تھا، مگر قدرت کو شاید اس کے گندے خون سے میرے ہاتھ رنگوانا منظور نہیں تھا، لہذا وہ اور اس کی پوری فیملی ایک رات خود ہی گیس کے کونکوں کی انگیٹھی بند کمرے میں سردی سے بچاؤ کے لئے رکھ کر سوئے تو اگلے روز اس کے آدمیوں نے انہیں مردہ ہی کمرے سے باہر نکالا قدرت نے چوہدری کو اس کے انجام تک پہنچا دیا تھا، مگر تب تک میرے اندر کے سمعان علی شاہد کی موت بھی واقع ہو گئی تھی۔ میں جو انسانیت کے دائرے سے باہر نکلا تو پھر بہکتا ہی چلا گیا۔ ان پڑھ دیہاتیوں کی بزدلی نے مجھے سمعان علی شاہد سے سنی دادا بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ذرا سی دھمکی سے سہم کر دیوار سے چپک جانے والے کم ہمت لوگوں پر حکمرانی کرنے کا نشہ روز بہ روز میرے اعصاب پر سوار ہوتا گیا۔ آسان لفظوں میں گاؤں کے ایک ایک فرد سے اپنے پیاروں کی المناک موت کا بدلہ لینا میرا نصب العین بن گیا انزل انہی دنوں میں ایک روز شہر سے آ رہا تھا تو راستے میں رفیق چاچا کی بیٹی کو چند شہری لڑکوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا، حقیقت وہ کچھ بھی ہو مگر اس وقت میں ایک دھان پان سے لڑکی کو تین چار لڑکوں کی حراست میں دیکھ کر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ رفیق چاچا کی بیٹی جو شکل سے گھبرائی دکھائی دے رہی تھی، اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ چلا چلا کر مجھے مدد کے لئے پکارنے لگی، میں ابھی تک حقیقت کو سمجھ نہیں پایا تھا، مگر اس کے باوجود میں اس کی کار پر لپک کر ان شہری لڑکوں کی طرف بڑھا تھا وہ کل چار لڑکے تھے اور میں اکیلا، مگر پھر بھی ان پر بھاری رہا تھا، ان لڑکوں کے بھاگ جانے کے بعد میں نے رفیق کی بیٹی کو بھی بہت ڈانٹا تھا، اس کی کوئی وضاحت سننے بغیر میں اسے اس کے گھر تک واپس لے آیا تھا۔ میں نہیں جانتا، مگر اس روز کے بعد جانے کیوں وہ مجھ پر فدا ہو کر رہ گئی تھی۔ بہانے بہانے سے بڑی ماں کے پاس آنا روزنت نئے پکوان بنا کر لانا، خواہ مخواہ مجھ سے بات کرنے کے بہانے تلاش کسی سے جھگڑا ہو جاتا تو رو رو کر آنکھیں سجا لینا، اس نے اپنا شیوہ بنالیا تھا۔ ایک طرح سے شیدائی ہو کر رہ گئی تھی وہ مگر مجھے اس کی یہ دیوانگی پسند نہیں تھی، لہذا میں اسے بے دردی سے نظر انداز کرتا رہا، انہی دنوں رفیق چاچا اور رشید چاچا نے اپنے بچوں کی باقاعدہ شادی کی تاریخ طے کرنے کا

فیصلہ کر لیا۔ رفیق چاچا کی بیٹی پر یہ خبر گویا بجلی بن کر گری تھی، جانے کس طرح وہ گھر سے بھاگ کر میرے ڈیرے تک آئی تھی اس روز اس نے مجھے بہت مجبور کیا۔ کہ میں اس کی محبت کو قبول کر کے اس کے گھر والوں کو اس ارادے سے روک دوں میں مگر میں نے اس کی کسی ریکویسٹ پر کان نہیں دھرے، الٹا اسے سمجھایا اور دھمکی بھی دی کہ اگر وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی تو میں ان کے باپ سے کہہ کر ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی کروا دوں گا۔ میری اس درجہ غیر دلچسپی پر شدید مایوس ہوتے ہوئے وہ گھر واپس پلٹ گئی تھی، میں تب بھی اس کے ارادوں سے باخبر نہیں تھا، گھر پہنچ کر اس نے نجانے کس جذباتی سوچ کے تحت خود اپنی زندگی کا چراغ اپنے ہاتھوں سے گل کر دیا۔ وہ کچھ لمحوں کے بعد پھر سانس لینے کو رکھا تھا، پھر دوبارہ سے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑتے ہوئے بولا۔

”میری حوصلہ شکنی پر شدید ہرٹ ہوتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کا چراغ خود اپنے ہاتھوں سے گل تو کر دیا مگر اپنے مرنے کے بعد وہ اپنی موت کا سارا الزام میرے سر رکھ گئی اس نے کہا کہ میں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے لہذا رسوائی کے خوف سے اس نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ یوں گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ ساجد حسین اور ایلان جعفری میرے خلاف ہو گئے، میں اس وقت ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا جب وہ شدید مشتعل ہو کر وہاں آیا، میرے پاس اس وقت کچھ پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے ایلان نے وہاں آتے ہی بنا کوئی بات کئے زمین سے اینٹ اٹھا کر میرے سر پر دے ماری تھی میں ابھی صورت حال کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ پولیس نے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔ وہ اس وقت بہت ایبوشل تھا، غصے میں گالیاں دے رہا تھا بدعائیں مانگ رہا تھا میرے لئے، وہ جرم، وہ گناہ مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا، اسی جرم، اسی گناہ کو لے کر وہ مجھے گنہگار ٹھہرا رہا تھا، تبھی میں زیادہ دیر تک ضبط کا مظاہرہ نہ کر سکا اور میں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ زندگی سخت ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔ میں کسی پر بلا وجہ ظلم کر کے دوسرا چوہدری بننا نہیں چاہتا تھا، مگر تمام گاؤں والوں نے مجھے رفیق کی بیٹی کا مجرم ٹھہرا کر مجھ سے نفرت برتنی شروع کر دی، کسی نے میرے منہ سے نکلے سچ پر یقین نہیں کیا گاؤں والوں کی حد درجہ بے حسی نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ جو میرے ظاہر و باطن سے آگاہ تھے وہ اب مجھ پر ایک آشنا نگاہ ڈالنا بھی گوارہ نہیں کر رہے تھے۔ میرے نام پر تھوک کر نفرت کا اظہار کیا جاتا۔ عورتیں میرے سامنے ہاتھ اٹھا کر میرے لئے بدعائیں کرتیں، میں نکھرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا پتھر کی طرح بے حس ہو کر رہ گیا۔ نفرت و محبت کے

میں اب، کم از کم کوئی ایک تو ہے جو میرے مرنے کے بعد میرے لئے.....“
اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا اس کے مقابل کھڑی انزلہ شاہ نے تڑپ کر
اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا تھا۔

”جب تک انزلہ شاہ کی سانسوں کا سلسلہ اس کے وجود سے قائم ہے، تب تک کوئی
گرم ہوا بھی اس کے سنعان شاہد کو چھو نہیں سکتی۔“
وہ آنکھیں جو اس وقت آنسوؤں سے خالی تھیں انہی آنکھوں میں سنعان علی شاہد
نے اپنے لئے بہت زیادہ محبت کا احساس ہلکورے لیتا ہوا دیکھا تھا۔

”میں نے تم سے اپنا سنعان شاہد واپس مانگا ہے سنی دے دو، مجھے میرا سنعان۔“
کتنا عجیب سا درد تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں کہ وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے
سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں پایا تھا۔

”میں مانتی ہوں کہ تم نے بہت درد سہا ہے بہت سے انمول رشتے بہت سے
خوبصورت دن گنوائے ہیں میرا یقین کرو سنعان میرے اندر کی لڑکی تمہارے دکھ پر بلک بلک
کر رو رہی ہے تمہارے جسم پر لگے ایک ایک گھاؤ سے میرے دل کا خون رس رہا ہے مگر.....
میں تمہیں مزید ان اذیتوں کے گود میں سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، نہیں دیکھ سکتی میں تمہیں
ان راستوں پر مزید بھٹکتے ہوئے، وہ رشتے وہ دن جو بہت انمول تھے وہ ہاتھ سے نکل گئے ہیں
سنعان، مرنے والوں کے ساتھ، کبھی مرا نہیں جاتا میں اپنی زندگی تمہارے ساتھ بسر کرنا چاہتی
ہوں، میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں مل کر اس گاؤں کی فلاح کے لئے کوئی کام کریں، اسے ترقی
دیں، تاکہ آئندہ یہاں کوئی چودہری جنم نہ لے سکے، پھر ان گلیوں میں، کسی سنی دادا کو اپنے
دوستوں کے ہنستے اور روتے ہوئے چہرے دکھائی نہ دیں، پلیز میرا ساتھ دو سنعان پلیز.....“

اس نے اپنے مرمریں سے ہاتھوں میں سنعان علی شاہد کا مضبوط ہاتھ تھام کر اس
سے ریکوریٹ کی تھی، مگر وہ چند ہی لمحوں کے بعد ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے
چھڑاتے ہوئے دور نکل گیا تھا۔

☆☆☆

چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لئے
یہ مناسب نہیں آدمی کے لئے
پیارے بھی ضروری کئی کام ہیں

احساس سے بہت دور نکل آیا تھا میں..... جب مجھ پر قیامت ٹوٹی تھی تو یہی گاؤں والے چپ
چاپ تماشہ دیکھتے رہے تھے مگر اب..... اب گویا ہر آنکھ میں خود سری اور نفرت نے سر ابھارنا
شروع کر دیا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس نفرت کا سبب میرا کوئی گناہ نہیں تھا۔“

اس سائے کے کچھ روز بعد میں پولیس اسٹیشن گیا۔ ایلان سے متعلق پوچھ گچھ کے
لئے..... جانتی ہوا انزلہ ایلان جعفری نے وہاں مجھے اپنے روبرو دیکھ کر کیا کیا.....؟
صرف ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر، اس نے انزلہ شاہ کی طرف سرسری سے
انداز میں دیکھا تھا، جو چپ چاپ بیٹھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

”ایلان نے وہاں اپنے روبرو پا کر، صبر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ میرے
سامنے پڑے ٹیبل پر اس ایس ایچ او صاحب کا پمپل اٹھا کر اس نے خاصی سرعت کے ساتھ
میرے کندھے اور پشت کو دو تین گولیوں سے داغ دیا، اس وقت وہاں اس کے اس غیر قانونی
مظاہرے نے پولیس والوں کو اس سے شدید بدظن کر دیا تھا۔ میرے زندہ بچ جانے کے چانسز
زیادہ نہیں تھے۔ مگر پھر بھی قدرت کی پاک و بے نیاز ذات نے مجھے زندگی کی طرف واپس لوٹا
دیا تھا۔ پورے اکیس دن ہاسپٹل کے بستر پر بسر کرنے کے بعد میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا
کہ ایلان جعفری کی ڈیڑھ ہونچکی ہے۔ کوئی جانے نہ جانے سمجھے نہ سمجھے مگر میں خدا کو گواہ بنا کر
تمہارے سامنے یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میں ہرگز ایلان جعفری کی موت نہیں چاہتا تھا۔ اس
کی انہونی موت کی خبر نے مجھے بہت شاک پہنچایا تھا اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا، میں نے اس کا
تصور بھی نہیں کیا تھا، مگر پھر بھی سب نے مجھے گنہگار سمجھا، مجھ پر جھوٹے بہتان لگائے رفیق کی
بیٹی کے ساتھ ساتھ، مجھے ایلان جعفری کی موت کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا، اتنا سب کچھ ہو
جانے کے بعد بھی میرے اندر کا مہذب سنعان شاہد، چپ چاپ نہ مرنے اور کیا کرتا انزلہ۔“

اپنی بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں خاصی سرخ ہو رہی تھیں تبھی انزلہ شاہ نے تھکی
تھکی سی ایک سانس خنک فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے نم نگاہوں سے اپنے لرزتے ہاتھوں کی
طرف دیکھا۔

”میں جانتا ہوں کہ اب ایک خوشگوار زندگی پر، میرا کوئی حق نہیں رہا ہے، ایک نہ
ایک دن میں بھی انہی راستوں پر بھٹکتا بھٹکتا کسی بدنام دہشت گرد کی مانند موت کی بے رحم
بانہوں میں چلا جاؤں گا، لیکن آج کے بعد میرا دل بہت مطمئن رہے گا انزلہ کوئی مجھے کچھ بھی کہتا
رہے، پروا نہیں بس ایک تم سے حال دل کہنے کے بعد میں بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ اس دنیا

پیار سب کچھ نہیں زندگی کے لئے
تن سے تن کا ملن ہو تو پایا ہی کیا
من سے من کا ملن کوئی کم تو نہیں
خوشبو آتی رہے دور سے ہی سہی
سامنے ہو چن کوئی کم تو نہیں
چاند ملتا نہیں سب کو سنسار میں
ہے دیا ہی بہت روشنی کے لئے
کتنی حسرت سے تکتی ہیں گلیاں مجھے
کیوں بہاروں کو پھر سے بلاتے نہیں
ایک دنیا اجڑ گئی ہے تو کیا
دوسرا تم جہاں کیوں بساتے نہیں
دل نہ چاہے بھی تو ساتھ سنسار کے
چلنا پڑتا ہے سب کی خوشی کے لئے
چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لئے
یہ مناسب نہیں آدمی کے لئے

زویا خان آفندی کے گھر کے سامنے، چند سیکنڈ ٹھہرنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ
بھرتا، سر سبز لان کو عبور کرتے ہوئے۔ وسیع ہال کی طرف چلا آ رہا تھا، جہاں وہ صوفے کے ایک
کونے میں سکر کر بیٹھی، خاصے انہماک سے اس گیت کو دیکھنے اور سننے میں محو تھی۔
شانزل علی شاہ کے قدموں کی آہٹ پر اس نے فوراً اپنے انہماک کو توڑتے ہوئے،
سرعت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ہیلو گڈنگل، کیسی ہو.....؟“

زویا خان کی توجہ خود پر مرکوز پا کر وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ
گیا تھا جب اس نے آہستہ سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا۔
”آپ کیسے ہیں اور اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ فارمیٹی بھرا رہی ہے۔ تبھی ایک دھیمی سی مسکان اس
کے لبوں پر بکھر کر رہ گئی۔

”ناراض ہو مجھ سے۔“ ذرا سا آگے جھک کر اس نے زویا آفندی کے سوال کو یکسر
نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا جب وہ خفگی سے منہ پھیرتے ہوئے بولی۔
”میرا آپ سے ایسا کوئی تعلق نہیں بنتا۔“
”اچھا..... اور ابھی جو پچھلے دنوں ہمارے درمیان ایک خوبصورت سا بندھن قائم ہوا
تھا، وہ.....“

شانزل علی شاہ یقیناً اس کے انداز و الفاظ سے خاصا مسرور ہوا تھا، مگر زویا خان کی
آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔
”اس تعلق کو بھی آپ جب چاہیں گے توڑ دیں گے، میں کیا کر لوں گی آپ کا۔“
زویا آفندی کے الفاظ پر ایک مرتبہ پھر وہ کھلکھلا اٹھا تھا۔
”سب کچھ تو کر چکی ہو یا، اب اور کرنے کو باقی کیا رہ گیا ہے۔“
”میں اس وقت بہت ڈپریشن میں ہوں، آپ پلیز یہاں سے چلے جائیں۔“
اس سے اپنے آنسوؤں کا بھرم رکھنا، خاصا دشوار ہو رہا تھا، تبھی بائیں ہاتھ کی پشت سے گال
رگڑتے ہوئے، جذباتی لہجے میں بولی، تو شانزل کی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔
”اوکے، اگر تم ڈپریشن ہو اور بات نہیں کرنا چاہتی ہو تو کوئی بات نہیں میں آنٹی
سے بات کر لیتا ہوں۔“

”آنٹی کہاں ہیں اس وقت۔“

”اپنی کسی فرینڈ کی پارٹی میں گئی ہیں۔“

”اچھا لیکن تم کیوں نہیں گئیں۔“

”میرا سر درد کر رہا تھا اس لئے۔“

”سر کیوں درد کر رہا تھا۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“

تک کر کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جب شانزل نے سرعت سے اس
کے بلیک آپنل کا کونا تھام کر اسے روک لیا۔

”اپنے شانزل کے قصور کو معاف نہیں کرو گی زویا۔“

اس کے الفاظ پر زویا آفندی کا دل مچلا تھا، مگر اس نے آنسوؤں سے لبالب بھری
نگاہیں پھیر کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”شانزل علی شاہ میرا ہے ہی کب۔“

”محبتوں میں اتنی بدگمانیاں ٹھیک نہیں ہوتیں زویا۔“

جانے کس احساس کے تحت اس نے کہا تھا، جب وہ اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔

”محبت کیسی.....؟ میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں کر سکتے۔“

”ویل..... لیکن تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔“

اب کے وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے عین اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔ نگاہیں بغور اس کے سرخ چہرے پر جمی تھیں تبھی وہ آہستہ سے نظریں جھکا کر بولی۔

”خوش فہمی ہے آپ کی..... مجھ جیسی لڑکیاں کبھی محبتوں کے روگ نہیں پالا کرتیں۔“

”اچھا..... خاصی نئی اطلاع ہے..... بہر حال یہ خوش فہمی ہے تو اس خوش فہمی میں، میں جینا چاہتا ہوں۔“

اس کے لُودیتے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ زویا خان سے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

”میں اپنے سن بی بیو کے لئے معذرت خواہ ہوں زویا..... میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا، مگر نجانے وہ سب کیسے ہو گیا، پلیز مجھے معاف کر دو۔“

بس..... اس کے کہنے کی دیر تھی اور ادھر زویا آفندی کا دل فوراً صاف ہو گیا۔

”معافی مت مانگیں پلیز، مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”اچھا..... اور ابھی جو مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ یہاں سے چلے جائیں، تب شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔“ شانزل علی شاہ کا دل بھی اس کی لرزتی پلکیں دیکھ کر فوراً ہلکا پھلکا ہو گیا تھا تبھی قدرے فریض لہجے میں بولا تو وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکادی۔

”آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تو شانزل بھی اطمینان سے مسکراتے ہوئے صوفے پر ٹپک گیا۔

”تمہیں اتنے بڑے گھر میں، اس وقت اکیلے ڈرنے نہیں لگ رہا۔“ زویا آفندی کو چائے کے ساتھ آتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا، جب وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں..... شروع شروع میں جب مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی تھیں تو بہت شدت سے رویا کرتی تھی، مگر اب..... اب تو شاید اس اکیلے پن کی عادت ہو گئی ہے۔“

تو کیا جانے دل کا درد

”خیر اب زیادہ دن تک میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنے والا۔“

بہت دلکش مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی، تبھی زویا خان نے ایک بے ساختہ نگاہ کے بعد فوراً پلکیں جھکالی تھیں دل کی دھڑکنوں نے ایک مرتبہ پھر سینے میں اودھم مچا دیا تھا۔

”میں آج یہاں آنٹی سے یہی بات کرنے آیا تھا، اب زیادہ دنوں تک میں خود بھی اکیلا رہنا نہیں چاہتا۔ شادی کے بعد میری خواہش ہے آنٹی بھی ہمارے ساتھ رہیں، زندگی کی ساری محرومیوں، ساری اذیتوں کا اختتام ہو جائے، کہیں کوئی بے قراری کوئی اضطراب نہ رہے۔ کیا اس خواہش کی تکمیل میں تم میری ہم نو ہونگی زویا۔“ انزل علی شاہ کے الفاظ نے اسے جی بھر کر شرمندہ کر ڈالا تھا۔ تبھی وہ اپنی کانپتی پلکیں اٹھا کر غار ہوتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں شانزل، میری چھوٹی سوچ نے آپ کو غلط سمجھا۔“

وہ اس وقت واقعی دل سے شرمندہ تھی۔ تبھی ایک محفوظ سی مسکراہٹ نے شانزل علی شاہ کے لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو زویا اور یہ میرا دل بہت اچھی طرح سے جانتا ہے لہذا میں تمہاری کسی بات کا کبھی مائنڈ نہیں کر سکتا۔“

”شاید میں دنیا کی خوش نصیب لڑکی ہوں کہ مجھے آپ جیسا ہم سفر مل رہا ہے۔“ شانزل نے دھیمے لہجے پر اس نے خاصے سرشار انداز میں کہا تھا، جب وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے پھر سے مسکرا دیا۔

”خوش نصیب تو شاید میں بھی ہوں کہ مجھے تم جیسی پیاری لڑکی کا ساتھ ہمیشہ کے لئے مل رہا ہے۔“ شانزل کے سرور انداز پر ایک لمحے کے لئے دھیمے سے مسکرانے کے بعد وہ پھر سے بولی تھی۔

”آج مجھے کامل یقین ہو رہا ہے کہ آپ سبعین الہدیٰ سے محبت نہیں کرتے۔“

زویا خان کے الفاظ پر یکنخت اس کے لبوں کی مسکراہٹ فوراً معدوم ہو گئی تھی، وہی اضطراب جس سے دامن چھڑا کر وہ یہاں اس وقت زویا آفندی سے ملے آیا تھا، پھر سے وہ اضطراب اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا تھا پورے بدن میں جیسے بے قراریاں پھر سے سرایت کر گئی تھیں بے ساختہ اس کا سن چاہا تھا کہ وہ اپنے بال فوج کر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا

چل چل کر محض اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس وقت اس کے لئے اپنے دل و اعصاب پر قابو پانا، قطعی ممکن نہیں رہا تھا۔

قطعی کم حواس کے ساتھ خاصی ریش ڈرائیونگ کرنے کے بعد جس وقت اس نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اس کا دل واضح دھڑک دھڑک کر کسی انہونی کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ لرزتے قدموں پر بے شکل اپنے بوجھ کے سہارے وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تو نظروں کے سامنے ہی وہ زمین پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی، بکھرا حلیہ اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ اس کے ساتھ پھر سے کہیں کوئی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ تبھی وہ سرعت سے لپک کر اس کے قریب آیا تھا۔

”سبعین..... آ رہا ہے؟“ شانزل کے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ مزید شدت سے بلک بلک کر رو پڑی۔

”ہوا کیا ہے سبعین.....؟ پلیز مجھے بتاؤ.....“ لمحے میں وہ جیسے شدید مضطرب ہوا تھا۔ جب سبعین نے اسے روتے ہوئے بتایا۔

”فیصل کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ..... وہ بہت سیریس کنڈیشن میں ہیں۔“

شانزل علی شاہ کو جو تکلیف اس کے آنسوؤں سے پہنچی تھی، اس تکلیف پر اس وقت اس کے الفاظ سے پہنچنے والی تکلیف زیادہ بھاری پڑ گئی تھی۔ تبھی اس نے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد مدہم لہجے میں پوچھا تھا۔

”اس وقت کون سے ہسپتال میں ہے وہ؟“

جواب میں سبعین نے اسے ہسپتال کا نام بتایا۔

”اوکے تم گھبراؤ نہیں میں ابھی جا رہا ہوں اللہ نے چاہا تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت سبعین الہدیٰ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو، فیصل شہزاد احمر سے اس کی محبت کے آنسو ہیں، یا اس کے مرنے کے بعد، بیوہ ہوجانے کی اذیت کے۔

”مم..... میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”نہیں..... اس وقت رات کافی ہو رہی ہے، تمہارا ساتھ جانا مناسب نہیں ہوگا۔“

”لیکن میں تمہارے ساتھ جاؤں گی پلیز۔“

خند تو جیسے اس کی فطرت میں شامل تھی۔

”سمجھنے کی کوشش کرو سبعین، گڑیا کو اس وقت گھر پر تمہاری ضرورت ہے اور پھر مجھے موسم بھی کچھ خاص ٹھیک نہیں لگ رہا ہے، میں فون پر تمہیں ایک ایک پل کی خبر دیتا رہوں گا۔“

دے کہ وہ سبعین الہدیٰ سے محبت نہیں کرتا مگر..... کتنی عجیب بات تھی کہ اس معاملے میں، خود اپنا دل اس کی ایک نہیں سن رہا تھا۔

”آج میں بہت مسرور ہوں شانزل کیونکہ آج میں نے اس یقین کو پالیا ہے کہ آپ صرف اور صرف میرے ہیں، اللہ نے آپ کو صرف میرے لئے بنایا ہے، ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی سبعین الہدیٰ نہیں آ سکتی، آپ کو سوچنے آپ کو چاہنے اور آپ کے دل و دماغ پر راج کرنے کا حق صرف میرا ہے نا شانزل۔“

شانزل کے مضبوط ہاتھوں پر اپنے نازک ہاتھ رکھے ہو جانے کے یقین کی ندیوں میں بہہ رہی تھی کہ اسی پل شانزل علی شاہ کے پرسل موبائل کی بزر تیزی سے بج اٹھی فون اس کے گھر سے تھا اور دوسری طرف بات کرنے والی شخصیت غالباً نہیں یقیناً سبعین الہدیٰ کی تھی۔

”ہیلو..... شانزل..... پلیز آپ جلدی سے گھر آجائیے، یہاں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ زار و قطار رو رہی تھی، اور اسی بات نے شانزل علی شاہ کے پاؤں تلے سے زمین کو نکالا تھا۔

”ہاں..... میں آ رہا ہوں سبعین..... تم گھبراؤ نہیں، مم..... میں بس ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا تو گم صم سی زویا آفندی کا سارا غرور سارا یقین پل میں مسمار ہو کر رہ گیا، کس قدر خالی نگاہوں سے اس نے شانزل علی شاہ کو دوڑتے ہوئے قدموں کو دیکھا تھا اور پھر جیسے وہیں بکھر کر ڈھیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لاکھ ضبط خواہش کے بے شمار دعوے ہوں

اس کو بھول جانے کے بے پناہ ارادے ہوں

اور اس محبت کا فیصلہ سنانے کو

کتنے لفظ سوچے ہوں

پر دل کو اس کی عادت پر

برملہ دھڑکنے سے

کون روک سکتا ہے؟

اے سبعین الہدیٰ سے محبت کا دعویٰ نہیں تھا مگر پھر بھی تارکول کی سڑک پر بے پناہ ٹریفک کے باوجود اندھا دھند گاڑی چلاتے ہوئے اس کے مضبوط ہاتھ اسٹیرنگ پر کپکپا رہے تھے، وہ سبعین الہدیٰ سے محبت کا دعوے دار ہیں، مگر پھر بھی اس کے دل کی ہر دھڑکن اس وقت

اب اس کی بات شاید سبعین الہدیٰ کی سمجھ میں آگئی تھی۔

شانزل خالی حواس کے ساتھ جس وقت ہاسپٹل پہنچا شب آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ اسے خاصی نیند بھی آرہی تھی، مگر سبعین الہدیٰ کے قرار کے لئے وہ اپنے آرام کی پرواہ کے بغیر صبح چار بجے تک ہاسپٹل میں فیصل احمر کے پاس موجود رہا پل پل سبعین کو کال کر کے مطمئن رہنے کی ہدایت کرتا رہا فیصل شہزاد احمر کی حالت بہت سیریس تھی۔

جس گاڑی میں وہ اپنی ہونے والی وائف کے ساتھ جا رہا تھا، وہ گاڑی خاصے برے طریقے سے بھاری ٹرک کے نیچے آگئی تھی۔ اس کے ساتھ موجود خاتون تو موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی، جب کہ اس کی سانس ابھی رک رک کر چل رہی تھیں۔

شانزل چونکہ سبعین کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، لہذا وہ بار بار اسے ”سب ٹھیک ہے“ کی تسلی دے رہا تھا۔ مگر اگلی صبح کو جب فیصل احمر کی سانسیں سبعین سے معافی مانگے بغیر، اپنی بیٹی کو محض ایک آخری نظر دیکھے بغیر چپکے سے ساتھ چھوڑ گئیں، تو حقیقی معنوں میں اسے خاصی پریشانی کا سامنا ہو گیا۔ اپنی طرف سے اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ فیصل شہزاد احمر سے شدید نفرت کے باوجود، وہ سبعین کی خوشی کے لئے اسے ہر ممکن کوشش کے ساتھ بچاتا رہتا تھا، مگر نہیں بچا پایا۔

فیصل کی ڈیڈ باڈی کو گھر لے جا کر اس کی آخری رسومات ادا کرنا ضروری تھا۔ لہذا ٹوٹے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ اس کے مردہ جسم کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پورے راستے وہ سوچتا رہا تھا کہ سبعین اس سانحے پر کیا راری ایکٹ کرے گی؟ وہ اسے کیسے سمجھائے گا۔ انہی سوچوں کے ساتھ وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا۔ تو لان میں ہی بے قراری سے ٹہلتی، سبعین الہدیٰ کی سماعتیں ایبویلنس کا ہارن سن کر اس کی بصارتیں جیسے بے جان ہو گئیں۔ شانزل، فیصل شہزاد احمر کی ڈیڈ باڈی کو گاڑی سے نکلوا رہا تھا۔

سبعین الہدیٰ کی پھٹی پھٹی بصارتوں کا ہر منظر جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنے تیزی سے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

شانزل کو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا، تبھی وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا تھا۔

”سبعین..... سبعین پلیز..... سنبھالو خود کو۔“

اسے گرنے سے بچانے کے لئے شانزل نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا، جب شدید ڈپریشن کی زد میں آئی سبعین الہدیٰ نے، خاصے تنفر کے ساتھ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس

کے وجود کو پرے دھکیل دیا۔

”نہیں چاہیے مجھے تمہاری نوازشیں، تمہارے دکھاوے کی ہمدردیاں نفرت کرتی ہوں میں تم سے، شدید نفرت۔“

اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی مگر اس کے باوجود بھرپور طاقت سے چلا رہی تھی۔ فیصل شہزاد احمر کی ڈیڈ باڈی کو اندر لانے والے ہاسپٹل کے عملے کے لوگ بھی ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”سبعین تم.....“ کن اکھیوں سے عملے کے لوگوں کی طرف سرسری سے انداز میں دیکھنے کے بعد اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا، جب وہ شدید ہسٹریک ہوتے ہوئے بولی۔

”کیا تم..... ہاں..... کیا تم.....؟ اجاڑ دیا ناں میرا گلشن پڑ گئی ناں ٹھنڈ تمہارے دل میں یہی تو چاہتے تھے تم..... اور کتنا پاش پاش کرو گے مجھے؟ اور کہاں تک دل دکھاؤ گے میرا تم مریکوں نہیں جاتے شانزل میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو سارے زمانے کو میرے خلاف کرنے کے بعد بھی تمہارا انتقام ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔“

وہ اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھی، مگر اس کے بے درد الفاظ نے شانزل علی شاہ کا دل ضرور جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کس قدر زخمی نگاہوں سے تڑپ کر اس نے سبعین الہدیٰ کی طرف دیکھا تھا، جو اسے فیصل شہزاد احمر کی موت کا ذمہ دار قرار دے رہی تھی۔

”کنتنے سنگدل ہو تم..... میری ہنستی کھیتی زندگی کو آنسوؤں کی نذر کر کے بھی تمہارا دل نہیں بھرا باپ کے گھر سے تو محروم کر ہی دیا، ایک شوہر کا آسرا بھی نہ رہنے دیا کیوں ایک ایک کر کے سارے سہارے چھین لئے مجھ سے.....“

شدت غم سے اس کا حلق زخمی ہو رہا تھا، خوبصورت آنکھوں سے ٹپاٹپ برستے آنسوؤں کے انمول موتی، اسے از حد آزرده کر رہے تھے۔ شانزل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنی صفائی کیسے پیش کرے؟ لہذا آہستہ سے سر جھٹک کر ایک دکھی سی نگاہ اس کے بکھرے ہوئے سراپے پر ڈالنے کے بعد وہ ہاسپٹل کے عملے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اگلے کچھ لمحوں اس نے ضروری امور نمٹا کر قریبی رشتہ داروں اور اپنے دوست و احباب وغیرہ کو کالز کر دیں تھیں۔ پاکستان سے باہر ذیشان رحمانی اور سحرش کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔

زویا خان تو اس کے کال کئے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ شانزل علی شاہ کے ایک دم سے چلے آنے پر، جو شدید دکھ اس نے محسوس کیا تھا، اس دکھ کی شدت اب سبعین الہدیٰ پر

اچانک ٹوٹ پڑنے والی قیامت اور شانزل کی پریشانی دیکھ کر خاصی کم ہو گئی تھی۔

سبعین کا حال واقعی افسوس کے لائق تھا۔ بے رنگ سے بکھرے حلیے کے ساتھ۔ وہ بچی کو گود میں لئے بالکل سن بیٹھی تھی۔ شانزل اور زویا دونوں مل کر تمام ذمہ داریاں سنبھال رہے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو ملنے کا کام زویا نے سنبھالا تو مردوں سے ملنے ملانے کفن دفن کا انتظام کرنے اور دیگر امور سرانجام دینے کی ذمہ داری شانزل علی شاہ نے سنبھال لی تھی۔

ذیشان رحمانی اور سحرش نے فوراً پاکستان آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ دکھ و رنج کی اس گھڑی میں سبعین الہدیٰ کو سنبھالنا، شانزل اور زویا کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ لہذا وہ شدت سے ان دونوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ وقت جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا۔ شانزل کی بے قراری عروج پر پہنچتی جا رہی تھی۔ عشاء کا وقت ہو چکا تھا مگر ذیشان اور سحرش کی آمد نہیں ہوئی، نتیجتاً شدید مجبوری کی حالت میں فیصل شہزاد احمر کو بالآخر اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا پڑا۔ رات گئے تک دور نزدیک کے سب احباب بھی رخصت ہو گئے۔ زویا خان وہاں رکتا چاہتی تھی شانزل کا خیال رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا ذہن بٹانا چاہتی تھی، مگر اس کی ممانے اس کی اجازت نہیں دی لہذا مجبوراً اسے اپنی ماما کے ساتھ اپنے گھر واپس جانا پڑا۔

کل شام سے شانزل نے سوائے ایک چائے کے کپ اور کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا، مگر اس کے باوجود اسے سبعین الہدیٰ کی فکر تھی۔ اس کی خراب طبیعت کا احساس تھا۔ تبھی آدمی سے زیادہ رات ڈھل جانے کے باوجود وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے کھانا گرم کر کے سیدھا اس کے کمرے میں چلا آیا جہاں وہ ننھی گڑیا کو سلائے بیڈ کی پٹی سے سرٹکا کر بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

”کھانا کھا لو سبعین..... تمہاری طبیعت آل ریڈی ٹھیک نہیں ہے ایسے میں زیادہ دیر تک بھوکے رہنا تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔“ کھانے کی ٹرے بیڈ کے قریب پڑے ٹیبل کی سطح پر رکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا، جب وہ شدید متفر لہجے میں بولی ”تو.....؟ تمہارے لئے تو اچھا ہی ہوگا، بار بار مارنے کی بجائے ایک بار ہی جان چھوٹ جائے گی مجھ سے۔“

”فضول بولنے کی بہت بری عادت ہے تمہیں۔“

وہ بری طرح سے جھنجھلا اٹھا تھا، جواب میں سبعین الہدیٰ کی زبان سے مزید ایک

حرف نہیں نکلا۔

”کب میرا یقین کرو گی سبعین.....؟ جتنا برا تم مجھے سمجھتی ہو، میں اتنا برا نہیں ہوں۔“

”مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے، آپ اچھے ہیں یا برے اس وقت پلیز جانیں

یہاں سے۔“

”او کے..... لیکن تم یہ کھانا کھا لینا پلیز۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ جانے کے لئے پلٹ

گیا تھا۔

”نہیں کھانا ہے مجھے کچھ بھی لے جاؤ اسے بھی اپنے ساتھ۔“ وحشت سے چلاتے

ہوئے اس نے ٹرے کو ٹیبل سے اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔ شانزل علی شاہ کے لئے اس وقت

اسے سمجھنا خاصا دشوار ہو رہا تھا۔

”قاتل ہو تم میرے، میرے پاپا کے، فیصل کے، نفرت کرتی ہوں میں تم سے مت آیا

کرو میرے سامنے۔“ وہ چیخ رہی تھی، جس کے باعث اس کے پاس لیٹی، فیصل شہزاد احمر کی بیٹی گھبرا

کر جاگ اٹھی تھی۔ شانزل اسی لمحے خود کو قطعی بے بس تصور کرتے ہوئے چپکے سے واپس اپنے

کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ وہ ساری رات اس نے سخت اذیت کے عالم میں آنسو بہاتے ہوئے بسر

کی تھی۔ سبعین الہدیٰ کی اپنی ذات سے اس درجہ نفرت نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس نے پھر سے ذیشان رحمانی کا موبائل نمبر پر بس کر

ڈالا۔ بیل مسلسل جا رہی تھی مگر کوئی کال رسیو نہیں کر رہا تھا۔ کل رات سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔

لہذا شدید جھلاتے ہوئے اس نے خود اپنا موبائل ہی سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔ گزرے ہر

لمحے کے ساتھ اپنے حلیے کی مانند وہ جیسے خود بھی بکھرتا جا رہا تھا۔

ابھی یہ اضطراب، یہ الجھن دور نہیں ہوئی تھی کہ سبعین الہدیٰ، اپنا مختصر سا سامان

پیک کر کے ننھی لاریب کی انگلی تھامے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔

”میں یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں مسٹر شانزل اپنے بھائی سے

رابطہ میں خود کر لوں گی، دوبارہ کبھی بھی میرے سامنے آنے کی زحمت نہ کرنا پلیز۔“ کہنے کے

ساتھ ہی اس نے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھائے تو شانزل علی شاہ کا ضبط جیسے جواب دے

گیا۔ شدید اشتعال کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ اس کے قریب آیا اور اپنا دایاں ہاتھ اس

کے نازک سے بازو میں گاڑتے ہوئے چلا کر بولا۔

”بس..... بہت غصہ دکھا لیا تم نے اب اور نہیں، جب تک ذیشان نہیں آ جاتا یہی گھر

تمہاری پناہ گاہ ہے، پھر اس کے بعد تم جہاں چاہو جا سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

غموں کی بندش ہیں خواب میرے

دکھوں کی بارش ہیں خواب میرے

اہل رہا ہے دکھوں کا لاوا، رہن آتش ہیں خواب میرے

خیال سارے جھلس گئے ہیں، سلگتی خواہشیں ہیں خواب میرے

اکھڑتی سانس ہیں زندگی کی، لہو کی سازش ہیں خواب میرے

جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو تو ایک شب کبھی نہ سو سکو گے

دن خاصا ڈھل چکا تھا دور نیلے آسمان پر اڑتے پرندے اب جیسے تھک ہار کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس پلٹ رہے تھے۔ فضا میں جس قدر بڑھ گیا تھا۔ اونچے اونچے سرسبز درختوں کے پتوں نے حرکت کرنا بند کر دی تھی۔ دور افق کے پار غروب ہوتا سورج، اب اپنی تاریکی کرین خاصہ تیزی کے ساتھ سمیٹ رہا تھا۔ قریب ہی کچے گھروں کے باہر موجود کچھ خواتین، دیواروں پر ایلے لگا رہی تھیں۔

تبھی انزلہ شاہ نے تھکی تھکی سی نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے دھول اڑتے کچے راستے پر اب دور دور تک کسی سمعان علی شاہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ یلخت ہی اس کے اندر تک جیسے تھکن اتر آئی تھی، گم صم سے حواس کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف واپس پلٹ رہی تھی، جب ایک مرتبہ پھر، اس کی نگاہ، ایلان جعفری کی پاگل ماں پر پڑ گئی۔ پھٹے پرانے میلے کپڑوں میں ملبوس بناء جوتے کے ننگے پاؤں، وہ بھاگ رہی تھیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے چند شریر بچے، ہاتھوں میں پتھر اٹھائے بھاگ رہے تھے۔

انزلہ شاہ کی حساس طبیعت کے لئے یہ نظارہ بہت تکلیف دہ تھا، لہذا ان حواس کے باوجود وہ لپک کر ان کی طرف بڑھی تھی۔

بیچاری بوڑھی عورت مسلسل بھاگنے کی وجہ سے اب ہانپنے لگی تھی۔ انزلہ شاہ نے انہیں اپنی پناہ میں لے کر بچوں کو ڈپٹنے ہوئے بھگا دیا تھا۔ پہلو میں ٹٹائیں مارتا درد، اس وقت اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ تصور کے آئینے میں جھم سے ایک سال پہلے کا ایک ایسا ہی دن چپکے سے در آیا تھا۔

اس روز یونیورسٹی سے آف کے بعد وہ ایلان جعفری کے ساتھ قدم با قدم چلتی پیدل ہی گھر کو واپس آ رہی تھی جب راستے میں ایک ایسی ہی بوڑھی پاگل عورت سے ان کا ٹکراؤ ہو گیا۔ ایلان کی والدہ کی مانند وہ بھی زخمی تھی۔ اس کے پیچھے بھی شریر بچے بھاگتے ہوئے جھکتیں

”میں آپ کے اعتراض کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں، میرا شوہر مجھے مجبور کر کے یہاں لایا تھا، اب وہ ہی نہیں رہا تو مجھے آپ کی اس پناہ گاہ میں رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ دو بدو چلتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔

”میں اس وقت تم سے بحث کے موڈ میں نہیں سمجھتا بہتر ہو گا کہ تم اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ۔“ سرخ غلافی آنکھوں میں تھکن نمایاں تھی، مگر سمیعین الہدیٰ نے اس کی طرف نہیں دیکھا تبھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضدی لہجے میں بولی۔

”امپاسیبل..... میں اب تمہارے اس گھر میں ایک پل کے لئے رکتا بھی قبول نہیں کر سکتی۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے تو شانزل نے پھر سے اس کا گداز بازو تھام لیا۔ اور وہ اسے، اسی کے کمرے میں قید کرنے کو تھا کہ اسی پل اس کے موبائل کی بزر تیزی سے بج اٹھی۔ سکرین پر نمبر چونکہ ڈیٹا کا تھا، لہذا بے تاب سے کال رسیو کی مگر دوسری جانب بولنے والا ڈیٹا نشان رسائی نہیں تھا۔ وہ لہجہ وہ آواز، اس کے لئے قطعی اجنبی تھی، مگر اس اجنبی آواز نے جودل کو چیر دینے والی روح فرسا اطلاع دی، اس کے جواب میں مضبوط اعصاب والا شانزل علی شاہ بھی جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو

تو ایک شب بھی نہ سو سکو گے

کہ لاکھ چاہو نہ ہنس سکو گے

ہزار چاہو نہ رو سکو گے

کہ خواب کیا، ہیں عذاب ہیں یہ

میرے دکھوں کی کتاب ہیں یہ

رفاقیت ان میں چھوٹی ہیں

محبتیں ان میں روشنی ہیں

پہنچتی ہیں ان میں وحشتیں بھی

اذیتیں ان میں پھوٹی ہیں

انہی کے ڈر سے خزاں ہیں جذبے

انہی سے شاخیں سی ٹوٹی ہیں

کر رہے تھے۔ تب ایلان جعفری نے لپک کر اس بوڑھی عورت کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ بچوں کو ڈپٹ کر بھگانے کے بعد اس نے محض اس بوڑھی عورت کے لئے ٹیکسی رکوائی تھی، پھر انزلہ شاہ کے ساتھ اسے اپنے فلیٹ میں لا کر بالکل ایک بیٹے کی طرح اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بوڑھی عورت کی پیشانی اور پاؤں پر لگنے والے زخم صاف کئے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلا کر اس کے بال خود سنوارے تھے، انزلہ شاہ کے ساتھ جا کر وہ اس کے لئے خود نیا لباس خرید کر لایا تھا۔ اس سارے عمل کے دوران جو خوشی و راحت اس نے ایلان جعفری کے چہرے پر دیکھی تھی۔ وہ خوشی و راحت آج سے پہلے اسے کبھی ایلان کے خوبصورت چہرے پر چھلکتی دکھائی نہیں دی تھی۔ تبھی شاید وہ اس سے پوچھتے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”ایلان..... میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم کبھی انسانیت کے لئے حد سے زیادہ پوزیو ہو جاتے ہو، افراتفری اور کینہ پروری کے اس دور میں بھی، ہر ایک سے بھلائی کرنے کی تمہاری اس عادت کو کیا سمجھوں.....؟ تمہاری نیک فطرت یا اچھی تربیت.....“

اسے آج بھی اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس کے سوال کے جواب میں ایک دھیمی سی مسکان ایلان جعفری کے گلابی لبوں پر بکھر کر رہ گئی تھی۔ پل دو پل کی خاموشی کے بعد گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”انزلہ جی، درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو.....، میں نہیں جانتا کہ میری معمولی سی ذات میں کوئی خاص خوبی ہے بھی یا نہیں، مگر میری ماں..... بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے، انزلہ تم کبھی میرے ساتھ گاؤں چلو، تو میں تمہیں دکھاؤں کہ عورت کی حقیقی تصویر کیسی ہے؟ ان کے پر نور چہرے کو دیکھتے ہی، ایک عجیب سا سکون دل میں اتر جاتا ہے، وہ جب میری پیشانی کو چوم کر لمبی عمر کی دعا دیتی ہیں ناں، تو ان کا ایک ایک لفظ مہکتا ہے انزلہ، میں تو خیر ان کی کل جاگیر ہوں ہی وہ تو ہر کسی کے لئے مہربان ہیں، یہاں تک کہ اگر چڑیا کا کوئی بچہ گھونسلے سے گر کر بے آسرا ہو جائے تو اسے وہ اپنی تحویل میں لے کر، خود پال لیتی ہیں اور بڑا کر کے اڑا دیتی ہیں پورے گاؤں میں، میری ماں سے بڑھ کر ملنسار، مہربان، صلح جو اور سب سے پیار کرنے والی۔ سب کے لئے خیر مانگنے والی، نیک عورت شاید ہی کوئی اور ہو، دوست تو ایک طرف، وہ دشمنوں کی آنکھ میں بھی آنسو نہیں دیکھ سکتیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔“

اس روز ایلان جعفری کی معرفت اس کی والدہ کے بارے میں سن کر بے ساختہ اس کے من میں اس نے ایک بارلے لینے کی خواہش شدت سے بیدار ہوئی تھی۔ مگر..... حالات نے

اس پیکر محبت اس نیک عورت سے ملایا بھی تو کس حال میں.....؟

”میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں انزلہ، یوں سمجھ لو کہ میرے لئے ان سے بڑھ کر، اس پوری دنیا میں کہیں کچھ نہیں ہے، گو بابا سے بھی بہت انج ہوں، مگر..... جو عقیدت مجھے اپنی ماں کے وجود سے، ان کی ذات سے ہے، اس کا اندازہ لگانا، خود میرے بھی اختیار میں نہیں ہے۔

قریب ہی کہیں سے اس کی آواز پھر ابھری تھی جواب میں انزلہ شاہ کی پلکیں فوراً آنسوؤں سے بھگ گئیں۔

”بیٹی..... میرے ایلان کو کہیں دیکھا ہے تم نے.....؟ صبح سے اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں نجانے کہاں چلا گیا ہے، دکھائی ہی نہیں دیتا۔ تم اسے ڈھونڈ کر لاؤ نا، اسے کہو، اس کی ماں اسے بلا رہی ہے دیکھنا، اسی وقت دوڑا چلا آئے گا وہ.....؟“

کمزور، کپکپاتے لہجے کی تھکن اس سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی، تبھی شدید دکھ سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے کئی آنسو، ٹپٹپ کر کے ایک ساتھ بہا دیئے تھے۔

”ایلان..... سے ملنا ہے آپ کو.....؟“ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھرایا تھا۔ تبھی بوڑھی عورت نے خالی خالی سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے، دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا، تو وہ چپ چاپ ان کا ہاتھ تھام کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر قبرستان کی طرف بڑھ گئی ”شہر خاموشا“ میں ابدی نیند سویا، وہ شہزادوں سی آنسو بہا کر..... خوبصورت شخص یہیں دفن تھا۔

”لیجئے آنٹی، اس منی کے ڈھیر تلے سوئے، اپنے ایلان سے مل لیجئے۔“

اپنے لہجے کی مانند وہ خود بھی زخم زخم ہو رہی تھی، تبھی جیسے تھک کر ایلان جعفری کی قبر کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ جب کہ ایلان جعفری کی ماں، حیران حیران سی نگاہوں سے آگے بڑھتے ہوئے اپنا کپکپاتا ہاتھ اس کی قبر پر بھرنے لگی۔

”مم..... میرا چاند یہاں آکر چھپ گیا ہے۔“

خون لٹائی زخمی نگاہوں سے پل دو پل کے لئے مڑ کر انہوں نے انزلہ شاہ سے پوچھا تھا۔ جو ضبط کے عالم میں آنسو پیتے ہوئے، چپ چاپ لب بھینچ کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”مم مگر..... یہاں اکیلے میں تو بہت ڈر لگتا ہو گا اسے، یہ تو کبھی اکیلا نہیں رہا، مجھ سے روٹھ بھی جاتا تھا، تو آکر میرے پاس ہی سوتا تھا۔ اتنی دیر تو کبھی ناراض بھی نہیں رہا مجھ

”تتمت سچ کہہ رہی ہوں وہ..... وہ گھر آجائے گا ناں.....“

”ہاں.....“ جانے کس ضبط سے اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، انہیں تسلی دی تھی اور پھر عین اس وقت کہ جب قبرستان کی دہلیز عبور کر رہی تھی۔ بے ساختہ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اسے یوں لگا کہ جیسے کہ ایلان جعفری اپنی قبر کے پاس کھڑا، غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے۔ اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ اس کے اس درجہ اچھے بیوی پر اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

زندگی بھر اسے کتنی خواہش رہی تھی کہ انزلہ کبھی اس کے ساتھ گاؤں چل کر، اس کے گھر والوں سے ملے۔ اس کا گھر بار دیکھے، وہ دونوں ساتھ ساتھ سرسبز کھیتوں میں گھومیں، پگھٹ پر جائیں کتنی ہی بار وہ اپنی ایسی چھوٹی چھوٹی سی خواہشات اس کے ساتھ ڈسکس کرتا رہتا تھا۔ مگر..... ایلان جعفری کی زندگی میں وہ اس کی یہ معصوم سی خواہش کبھی پوری نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ اس کا شہر اس کے گاؤں کے بالکل قریب تھا۔ اجازت کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ خود اس کے آباؤ اجداد بھی اسی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی، وہ اس کے ساتھ، کبھی یہاں نہیں آ سکی تھی، اپنے گھر سے ہٹ کر کہیں جانے کو طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔

مگر آج..... جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا، تو وہ یہاں چلی آئی تھی۔ ہر حقیقت سے بے خبر ہو کر سارے انکشافات ساری حقیقتیں یہیں آ کر اس پر منکشف ہوئی تھیں۔

اس روز وہ ایلان کی والدہ کے ساتھ پہلی بار اس کے گھر آئی تھی۔ صاف ستھرا سرخ اینٹوں سے تعمیر کشادہ گھر واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سرخ دھلی ہوئی اینٹوں سے بنے وسیع صحن میں پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی سی دھوپ خاصی اچھی لگ رہی تھی۔ دیوار کے ایک طرف رکھے گملوں میں گلاب موتیا اور چنبیلی کے پھول لگے تھے۔ وہ چونکہ ایلان کے علاوہ اس گھر کے کسی فرد سے واقف نہیں تھی۔ لہذا بوڑھی عورت کے ساتھ صحن میں ہی ایک طرف رکھی چارپائی پر، چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اتنے میں اندر کمرے سے ایک خوش شکل سی نوجوان لڑکی باہر نکلی اور اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی، انزلہ شاہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی، انزلہ کی نگاہ بھی اس پر پڑ چکی تھی، تبھی اس نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر فوراً سلام داغ دیا تھا۔ جواب میں وہ بدستور حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

”آ..... آپ یہاں.....؟“ انزلہ کو اس کے سوال نے خاصا حیران کیا تھا۔ تبھی وہ

سے..... پھر اب کیوں خفگی دکھا رہا ہے۔ اسے کہو ناں، میرے ساتھ چلے اپنی ماں کے ساتھ.....“
درد سے بوجھل ہوئی آنکھوں میں تیرتے آنسو انزلہ شاہ کا دل پاش پاش کر گئے تھے، تبھی وہ جیسے ضبط کا مزید یار نہ رکھتے ہوئے سسک پڑی تھی۔

”ایلان اب آپ کی کوئی بات نہیں سن سکتا آئی، کیونکہ کچھ بھی سننے اور کہنے کا اختیار اس سے چھین چکا ہے، مگر چکا ہے آپ کا ایلان..... مت ڈھونڈئے اب اسے گاؤں کی گلیوں میں، پلینز.....“

شدت غم سے بوجھل دل کے ساتھ بالآخر وہ رو پڑی تھی، جواب میں انہوں نے قدرے چونک کر اس کی طرف نگاہ کی پھر آپ ہی آپ بڑبڑاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں۔

”جھلی نہ ہو تو..... ابھی تو میں نے اپنے ایلان کی شادی کرنی ہے، میرے گھر میں چاند سی ہو آئے گی، میں..... میں..... اپنے پوتے پوتیوں کو کھلاؤں گی، ابھی کیسے مر سکتا ہے میرا، ایلان.....؟ ابھی تو بہت چھوٹا ہے وہ، ابھی دنیا میں آ کر دیکھا ہی کیا ہے اس نے.....؟“

انزلہ شاہ کو مزید ضبط کا یار نہیں رہا تھا، تبھی وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔

”ایلان..... گھر چل ناں پتر..... دیکھ تیرے بابا جی، تیرے لئے پریشان ہو کر، کتنے بیمار ہو گئے ہیں، مریم بھی ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے، جیسے ابھی تو آئے گا اور اسے خوب تنگ کرے گا، آج تو تیرے پسند کی کھیر بھی پکائی ہے میں نے کھیر تو بہت شوق سے کھاتا ہے ناں تو.....؟ گھر چل پتر..... دیکھ تجھے تلاش کرتے کرتے، اب میرے پاؤں میں چھالے بھی پڑ گئے ہیں اور کتنا ستائے گا اپنی ماں کو.....؟ ماں صدقے پتر..... کب تک ناراض رہے گا مجھ سے۔“

ساری دنیا سے بیگانی ہو کر وہ اپنی ہی زد میں، ایلان جعفری کی قبر پر محبت سے ہاتھ، پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی، جب انزلہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لئے۔

”شام ہو گئی ہے آئی، پلینز گھر چلیں۔“

”نہیں نہیں..... تم جاؤ، میں اپنے بچے کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

ضدی بچے کی مانند اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے، وہ ایلان جعفری کی قبر کے ساتھ مزید لپٹ گئی تھیں۔ جب اس نے بے بسی سے آنسو پیتے ہوئے غم لہجے میں کہا۔

”ایلان ابھی یہاں نہیں ہے، آپ پلینز گھر چلیں، وہ ہمارے پیچھے پیچھے آجائے گا۔“

اپنائیت سے پوچھ بیٹھی۔

”جی..... لیکن..... آپ مجھے کیسے جانتی ہیں.....؟ جہاں تک میرا خیال ہے میں فٹ ٹائم آپ سے مل رہی ہوں۔“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے، لیکن اس کے باوجود میں آپ کو جانتی ہوں۔“

اپنے سامنے کھڑی اس خوبصورت سی لڑکی کے الفاظ پر وہ خاصی حیران ہو رہی تھی،

جب اس نے مزید بتایا۔

”میں نے پہلے ہی آپ کو دیکھا ہے، ایلان بھیہا کے ساتھ، آپ کی بہت سی تصاویر

ہیں میرے پاس جو بھیہا مختلف تقریبات میں کھینچ کر وقتاً فوقتاً مجھے بھجواتے رہتے تھے۔ آپ دیکھیں گی وہ تصاویر۔“

سامنے کھڑی اس اجنبی لڑکی کے سوال پر انزلہ شاہ نے دھیمے سے سر ہلایا تھا، اور پھر

فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وسیع برآمدے کے ساتھ ایلان جعفری کا صاف ستھرا بیڈروم تھا۔ کمرے میں موجود

صوفہ سیٹ بیڈرائیٹنگ ٹیبل، وارڈروب، ٹی وی ٹرائی، سب اپنی اپنی جگہ خاصی مہارت سے

رکھے گئے تھے، دیوار کے ایک طرف بنی بک شیلف میں بے شمار کتابیں خاصی ترتیب سے سجائی

گئی تھیں۔ ڈرائیٹنگ ٹیبل پر دھڑے کئی پرفیومز، کرمیں اور شیو کا سامان یوں دکھائی دے رہا تھا،

گویا وہ ابھی انہیں استعمال کر کے کمرے سے باہر نکلا ہو، اس کے شاندار بیڈروم میں موجود، ہر

چیز اس کے یہیں کہیں، آس پاس ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ اس لمحے انزلہ شاہ کا دل

شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں موجود ایک ایک چیز کو خود اپنے ہاتھ سے چھو کر

اس کے ہونے کے احساس کو محسوس کرے۔ مگر چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنی خواہش پر عمل نہیں

کر پائی تھی۔ مریم نے مختلف تصاویر کے دو تین اہم، ایلان کی سیف سے نکال کر اسے تھمائے

تھے۔ گزرے ہوئے بہت سے خوبصورت دنوں کی سنہری یاد، ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے اس

کے دل میں تازہ ہو گئی تھی۔ ابھی وہ ان تصاویر کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ مریم نے ایلان شاہ

کی پرسنل ڈائری بھی لا کر تھما دی۔

”اسے پڑھ لیجئے تب تک میں آپ کے لئے چائے بنا لاتی ہوں۔“ دھیمے لہجے میں

کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ تو انزلہ شاہ کو مزید حیرانگی کے احساس نے گھیر لیا۔

سب مرحلے وفا کے جفا کے سپرد ہیں

وہ دیپ کیا جلیں جو ہوا کے سپرد ہیں

اس نے بھی اپنی ضد نہیں چھوڑی اس کی طرح

ہم کیا کریں کہ ہم بھی انا کے سپرد ہیں

”ہیلو مسٹر..... ہم اس وقت کراچی ایئر پورٹ سے بول رہے ہیں، آپ کی

انفارمیشن کے لئے افسوس ناک خبر ہے کہ دوحہ سے پاکستان آنے والی فلائٹ، خراب موسم کے

باعث حادثے کا شکار ہو گئی ہے، ہم جاں بحق مسافروں کے لواحقین سے مسلسل رابطہ کر رہے

ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس حادثے میں ذیشان رحمانی اور ان کی وائف مسز

سحرش بھی ہلاک ہو گئی ہیں، ہم نے ان کے موبائل میں آپ کی لاسٹ کال دیکھ کر آپ سے

رابطہ کیا ہے، پلیز..... جس قدر جلد ممکن ہو سکتا ہے، آپ یہاں تشریف لے آئیں.....“

شانزل علی شاہ کی سماعتیں سن ہو رہی تھیں، کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل چھوٹ کر

نیچے زمین پر جا گرا تھا، جانے کس مشکل سے اس نے خود کو سنبھال کر، اپنا وجود قریبی صوفے

کے سپرد کیا تھا۔ اندر دل میں یہاں وہاں تیز آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔

سبعین الہدیٰ نے خاصی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مضبوط اعصاب کا

مالک وہ شخص اس وقت خاصا کٹھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا، تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ

پوچھنے کی جسارت کرتی اپنی غم آنکھوں کو دباتے ہوئے وہ خود ہی اس سے مخاطب ہو گیا۔

”میں ابھی اور اسی وقت کراچی ایئر پورٹ جا رہا ہوں، میری واپسی تک یہیں رہنا،

پلیز.....“

کہنے کے ساتھ ہی وہ سرعت سے اٹھ کر وسیع لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔ سبعین

الہدیٰ اپنی خوبصورت آنکھوں میں ڈھیروں حیرانی لئے اسے پکارتی ہی رہ گئی تھی، مگر شانزل علی

شاہ نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا خاصی تیزی کے ساتھ وہ گیراج سے اپنی گاڑی نکال

کر، گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ڈرائیونگ کرنا بہت دشوار ہو رہا؟

تبھی کچھ فاصلے پر آ کر اس نے گاڑی کو بریک لگا دی۔

بڑے بڑے دکھ کو کڑوے گھونٹ کی مانند پی جانے والا وہ شخص اس وقت اسٹیر

سر رکھے بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہا تھا۔ دل کے ایک گوشے میں جہاں سبعین الہ

آخری سہارہ بھی کھو جانے کی تکلیف تھی، وہیں یہ دل اپنی جان سے پیاری ہنستی کھیلتی گڑا

سحرش علی شاہ کی المناک موت کے سانحے کو کسی صورت قبول نہیں کر رہا تھا۔

رہ رہ کر اس کا ہنسا مسکراتا اور کبھی روتا ہوا عکس اس کی نگاہوں میں جھللا رہا تھا اور اس کا دل اس لمحے جیسے ہزار ٹکڑوں میں منقسم ہو کر خود اسی کے قدموں میں بکھر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں جیسے ایک دم سے بے جان ہو گئے تھے۔ بے درد زندگی کے سفاک لمحوں نے بالآخر اس کے آخری خون کے رشتے کو بھی اس سے دور کر دیا تھا۔ سلگتی آنکھوں میں مچلتے آنسو، تپتے رخساروں پر بکھرتے ہوئے بہت بے مول ہو رہے تھے، ساری دنیا سے بے نیاز ہوا وہ شخص اس وقت اپنے اندر کا سارا درد ان آنسوؤں میں بہا رہا تھا۔ گاڑی کو ڈرائیو کرنا اس لمحے اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا، لہذا بہت مجبور ہو کر اس نے اپنے ایک قریبی دوست کو کال کر کے فوراً وہاں بلوایا تھا۔

پورا دن ڈھل چکا تھا دھیرے دھیرے سرکتے لمحوں نے شام کی سیاہی پر بھی رات کی تاریکی کو طاری کرنا شروع کر دیا تھا۔ نہایت ست روی سے ریگتے ان لمحوں میں سبعین الہدی کا دل از حد تفکرات کا شکار ہو رہا تھا۔ شانزل علی شاہ کے ہاتھوں سے چھوٹا موبائل اور اس کے کم حواس اسے اندر سے دھلا گئے تھے۔ نازک سے دل کی مچلتی دھڑکنیں کہیں ضرور کچھ غلط ہونے کی شہادت دے رہی تھیں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے؟ بے قراری نے لاؤنج میں چکر لگاتے لگاتے بھی ٹانگیں جیسے جواب دے گئی تھیں۔ گزرتا ہر لمحہ اس کے اضطراب کو بڑھا رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر اپنی سماعتوں میں ایسبولینس کی دل دہلا دینے والے ہارن کی آواز اتری تھی اور وہ جیسے وہیں زمین پر بے حس و حرکت ہو کر بیٹھتی گئی۔ پھٹی پھٹی بصارتوں نے، جو قیامت خیز منظر دیکھا تھا، اس کے بعد وہ اس پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ اپنے حواس پر قابو رکھتی، دل درد کی شدت سے جیسے پھٹ پڑا تھا، وہ بلک بلک کر رونا چاہتی تھی، جو کچھ ہو گیا تھا، اس پر بے یقینی کا اظہار کرنا چاہتی تھی، مگر اس کے حواس اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ وہ اپنی تیزی سے بند ہوتی پلکوں کو اپنے اختیار سے روک بھی نہیں پاتی تھی۔ لڑکھڑا کر گرتے، اس کے ٹھٹھا حال وجود کو، شانزل علی شاہ نے خاصی تیزی کے ساتھ لپک کر اپنی بانہوں میں سنبھالا تھا۔

”مگر..... تب تک بہت دیر ہو گئی تھی سفید پڑتے چہرے کے ساتھ تیزی سے بند ہوتی، اس کی لمبی پلکیں، اس کے وجود کو گھمبیر اندھیروں کے سپرد کر چکی تھیں۔ مسلسل امتحانوں کی زد میں آئے شانزل علی شاہ نے کسی درجہ پریشانی کے ساتھ، ان لمحوں میں سرد ہوتے، ہاتھوں کی حرارت محسوس کی تھی۔ ایک طویل عرصے سے لپ اسٹک سے بے نیاز ہوئے اس کے

احمر لب، نیلے پڑ رہے تھے، گزرتے ہر لمحے کے ساتھ وہ اسے خود سے دور جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، تبھی بمشکل کپکپاتے ہاتھوں سے کوٹ کی، جیب میں پڑا، موبائل نکال کر تیزی سے اس نے کچھ نمبرز پریس کئے اور پھر اس کے نازک سے وجود کو بانہوں میں بھر کر خود سے قریب کرتے ہوئے، وہ جیسے خود بھی اپنا ضبط کھو بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وفا جب مصلحت کی شال اوڑھے

سردرت کا روپ دھارے

دل کے آنگن میں اترتی ہے

تو پلکوں پر ستاروں کی دھنک مکاٹے لگتی ہے۔

کبھی خوابوں کے ان چھوٹے ہیولوں سے بھی

ان دیکھی سی، انجانی سی خوشبو آنے لگتی ہے

کسی کے سنگ بیٹے ان گنت لمحوں کی زنجیریں

اچانک ذہن میں جب گنگنائی ہیں

تو یوں محسوس ہوتا ہے

ہوائیں آکے سرگوشی کرتی ہیں

محبت کا تمہیں ادراک اب تو ہو گیا ہوگا

یہ جو بھی زخم دیتی ہے، کبھی سینے نہیں دیتی

محبت روٹھ جائے تو کبھی جینے نہیں دیتی

ایمان شاہ کی ڈائری اس کے ہاتھ میں تھی اور اس کے آنسو قطار در قطار پلکوں کے لڑھک کر گالوں پر بکھر رہے تھے۔ نظر کے بالکل سامنے ہی موتیوں سے شفاف الفاظ میں، کتنی خوبصورتی کے ساتھ، اس نے بہت سے صفحات اس کے نام پر، نیلی روشنائی سے سیاہ کر رکھے تھے۔ اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ وہ کب ان الفاظ کے سحر میں الجھ کر بکھرتی چلی گئی تھی۔

”انزی میں جانتا ہوں کہ تم سعان علی شاہد میں انٹرنیڈ ہو، تمہاری ستاروں سی روشن نگاہوں میں جھپکتے جگنو میرے نام کے نہیں ہیں، محبت زبردستی کا سودا ہے بھی نہیں کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو شاید کل میری محبت کو پالیتی مگر ایسا نہیں ہے۔ میں شاید کبھی تم سے یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں، میں نہیں جانتا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ کیوں اس محبت کے

سرائے دہر میں، اندیشہ ہائے زندگانی میں
تم ہی دل کا سہارا ہو
جو روح کے آسمان پہ جگمگایا ہے محبت سے
سہانی شام کی چاہت کا تم وہ پہلا تارہ ہو
وفا کا استعارہ ہو

چلو تم کو بتاتے ہیں
تمہارے قرب کی خوشبو سے پتھر کی طرح سلگتی دھوپ میں
کہ ہم ساون رتوں میں بھیگتے پیروں کو چھو لیں تو
تمہارے لمس کی خوشبو کے لمحے جگمگاتے ہیں
چلو تم کو بتاتے ہیں

آنسو اب بھی قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بکھر رہے تھے، مگر اب ان میں پہلے جیسی
شدت نہیں تھی۔ گلاب بھی سینے میں دھڑکتا، چلتا دل اس کی دائمی جدائی کے دکھ پر درد سے کٹ رہا
تھا۔ گلاب بھی دھڑکنیں بین کر رہی تھیں۔ زندگی بھر اس کے دل کی کہانی نہ جان پانے کا افسوس
اس کی سانسیں الجھا رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ٹوٹ کے بکھری نہیں تھی۔ اندر کہیں یہ احساس بہت آہستگی
کے ساتھ سر اٹھا رہا تھا کہ ایلان شاہ کو سعادان شاہ سے ذاتی پر خاش تھی۔ وہ اس سے حسد کرتا تھا
انزلہ شاہ کو حاصل کر لینے کی خواہش میں اسے جان سے مار دینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر کتنی عجیب بات
تھی کہ وہ خود اپنے اس جنونی جذبے کی بھیجٹ چڑھ چکا تھا۔ صرف ایک دل میں لگی رقابت کی
آگ بجھانے کے لیے اس نے کتنی بہت سی زندہ آنکھوں کے دیپ بجھا ڈالے تھے۔

اس روز وہ ایلان جعفری کے گھر سے آئی تو جسم کی ایک ایک پور میں تھکن کا احساس
غالب تھا، پورے تین روز تک وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھی، عجیب ایک سوگوار سی کیفیت میں
جتلا ہو کر بستر پر پڑی رہی تھی۔ سعادان شاہ کے متعلق اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ساتھ والے گاؤں
کے چوہدریوں کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے کے بعد کیس عدالت میں کا داخل کروا چکا
ہے، لہذا دونوں طرف سے کچی دشمنی کی بنیاد طے پا گئی تھی۔

وہ اس کی بے حسی دیکھ کر اس سے غافل ہو جانا چاہ رہی تھی، مگر اس سے غافل ہی تو
نہیں ہو پارہی تھی، اور شاید یہی محبت کی حقیقت تھی۔

بہت سے دن یونہی بیت گئے تھے جلتے سلگتے بیزار..... اس روز وہ بہت دنوں کے

جذبے میں مغلوب ہو کر قیس نے ہنسی خوشی پتھر کھائے، کیوں؟ مہینوں چناب کی نذر ہوا، جانے
کیوں رانجھے نے ہیر کی محبت میں، خود اپنی ذات کو فقیر کر لیا، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے
دل کی ہر خوشی، تمہارے چہرے کی مسکراہٹ سے جڑی ہے، تم ہنستی کھلکھلاتی ہو، تو میرا دل
سکون سے رہتا ہے، مگر جب کبھی میں تمہیں اداس یا مغموم پاتا ہوں، تو کسی کل قرار نصیب نہیں
ہوتا، ہر پل، ہر طرف بس تم ہی تم دیکھائی دیتی ہو، عجیب پاگل سا ہو کر رہ گیا ہوں میں، سمجھ میں
کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں.....؟“

کچھ صفحے پلٹ کر اس کی نظر ایک مرتبہ پھر اس کے موتیوں سے شفاف الفاظ پر ٹھہر
گئی تھی۔

”انزی کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے، میں کوئی منتر پڑھوں اور تم میرے ساتھ ساری دنیا
سے اوجھل ہو جاؤں، ہم دونوں ایسی دنیا میں چلے جائیں، جہاں ہمارے درمیان تیسرا کوئی نہ ہو،
مگر دیکھو، میں کتنا بد نصیب ہوں چاہ کر بھی تمہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ اے کاش کہ تم سعادان علی شاہد
کے سامنے نہ آتیں۔ اے کاش کہ تمہیں اس سے محبت نہ ہوئی ہوتی، اے کاش کہ تم میری آنکھوں
میں چھپا میری محبت کا گہرا راز سمجھ جاتیں۔ سچ انزلہ کبھی کبھی میرا من شدت سے چاہتا ہے کہ میں
تمہارے سعادان علی شاہد کی جان لے لوں۔ ختم کر دوں اسے، کیوں کہ تم مجھ سے اس کی باتیں کرتی
ہو، اس کے لیے سوچتی ہو، مضطرب ہوتی ہو، اس کا راستہ دیکھتی ہو، تو میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔
میں برداشت نہیں کر سکتا انزلہ، تمہاری آنکھوں میں اس کا عکس تمہارے دل میں اس کی محبت مجھ
سے برداشت نہیں ہوتی۔ اے کاش کہ چوہدری نے اس کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی ختم
کر دیا ہوتا اور شاید ایسا ہو بھی جاتا، مگر وہ بڑھیا ہے ناں، سعادان کی بڑی ماں اس نے اسے مرنے
نہیں دیا، موت کے منہ سے بچا لیا، اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہ بڑھیا سعادان کے پاس چلی آئی، ایسا
کیوں ہوا انزلہ.....؟ تم صرف میری ہو، میں تمہیں اس کی زندگی کا حصہ بننے نہیں دوں گا۔“

ایلان شاہ کے ایک ایک لفظ میں انزلہ شاہ کے لیے اس کی جنونی محبت کا عکس بڑے
واضح انداز میں چمک رہا تھا۔ کتنا گہرا شخص تھا وہ..... زندگی کی آخری سانس تک اس نے اپنی
پرشدید محبت کا بھید اس پر کھلے نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ تم ایمان ہمارا ہو

میں جیسے ایک دم سے سناٹے اتر آئے، کتنے ہی لحوں تک تو اسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا تاہم اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل کے دفاع میں اس سے کچھ بھی کہتا، وہ پھر سے بول اٹھی۔

”میں اب کبھی تم سے یہ نہیں کہوں گی کہ تم یہ غنڈا گردی چھوڑ دو، کیوں کہ میں جان گئی ہوں کہ تمہیں اپنی خوشی، اپنی ضد، میری محبت سے بڑھ کر عزیز ہے۔ آج مجھے خود سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے سنعان کہ میں نے محبت جیسے خوبصورت جذبے کے لیے تم جیسے غلط انسان کا انتخاب کیا، میں تو کیا، تم کسی بھی اچھی لڑکی کی محبت کے قابل نہیں ہو، جھوٹ تھا وہ سب کچھ جو تم نے مجھ سے کہا، فریبی محبت تھی تمہاری، تم.....“

”بس..... آگے ایک لفظ مت بولنا انزلہ، میں اپنی محبت کے معاملے میں تمہارا کوئی بہتان برداشت نہیں کر سکتا.....“

شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ روشن پیشانی پر غصے کی رگ پھڑپھڑانے لگی تھی۔ انزلہ شاہ کو اس کا یہ روپ سہا دیتا تھا، مگر اس وقت وہ بالکل ساٹ چہرے کے ساتھ بڑی بہادری سے اس کے سامنے کھڑی اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جہاں اس وقت ایک طوفان چل رہا تھا۔

”سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے سنعان اور تمہاری محبت کا سچ یہی ہے کہ وہ فریبی تھی جسٹ اے جوک تھی، محض کچھ وقت کے لیے دل بہلانے کا بہانہ تھی۔“

”چٹاخ.....“

آج دوسری بار سنعان شاہد نے ضبط کے تمام ہتھیار کھو کر اس کے چلانے پر اسے چائنا رسید کیا تھا، مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اس چاننے نے درد اور تکلیف کے بجائے، انزلہ شاہ کو دلی راحت سے ہسٹنا کر دیا تھا۔ تھڑکی شدت کے باعث اس کے گلابی لبوں سے خون رسنے لگا تھا، مگر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھی۔

”تھینکس.....“

ڈیڈ بائی آنکھوں میں تشکر کا احساس لیے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت آہستگی کے ساتھ اس نے کہا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ سنعان علی شاہد اپنے اس عمل کی معافی مانگتا۔ قریبی کھیتوں سے تین چار نقاب پوش ہاتھوں میں مختلف ہتھیار لیے سنعان شاہد کی طرف بڑھ گئے وہ ہکا بکا سی محض دیکھتی رہ گئی تھی۔ مگر اس سے زیادہ حیرانگی اسے سنعان کے چپ چاپ مار کھا لینے پر ہو رہی تھی۔ نقاب پوش اسے خاصی بے دردی کے ساتھ پیٹ رہے تھے، مگر وہ اپنے

بعد بڑی ماں سے ملنے سنعان شاہد کے ڈیرے کی طرف آئی تھی۔ مگر وہ اسے راستے میں ہی ہرے بھرے کھیتوں کے قریب ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا مل گیا۔ لہذا وہ اپنے قدموں کا رخ موڑتے ہوئے جھکے جھکے سے قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”زہے نصیب، آج تو حسن خود چل کر ہماری طرف کھینچا آیا ہے۔“

اس کے تیور بدلے نہ انداز مگر انزلہ شاہ کا دماغ ضرور بدل گیا تھا، تبھی وہ بولی تو اس کے لہجے میں جیسے صدیوں کی تسکین تھی۔

”میں گاؤں سے واپس اپنے شہر جا رہی ہوں سنعان، شاید اب دوبارہ کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آسکوں، مگر جانے سے قبل بس آخری بار تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں، سچ سچ جواب دو گے.....؟“

سنعان شاہد علی نے لب بھینچ کر صرف ایک نظر اس کی اداس آنکھوں کی طرف دیکھا تھا، پھر چپ چاپ آہستگی سے اٹھ کر رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

”شہر واپس پلٹنے کا فیصلہ کر کے تم نے بہت اچھا کیا ہے پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو۔“

انزلہ شاہ بخوبی جان گئی تھی کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک بے حس پتھر ہے۔ جس پر کوئی بات کوئی جذبہ کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ لہذا ٹوٹ کر بکھرنے سے قبل، ہار جانے کی اذیت برداشت کرنے سے قبل وہ آج ایک آخری پتہ پھینکنے آئی تھی۔ تبھی ہنوز اداس لہجے میں بولی۔

”میں جانتی ہوں کہ کبھی کسی دور میں تم نے مجھے چاہنے کی حماقت کی تھی، یقیناً مجھے پالینے کے سہانے خواب بھی ضرور دیکھے ہوں گے تم نے، مگر ان خوابوں کی تعبیر پانا تمہارے نصیب میں نہیں تھا سنعان، خیر مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے، میرے۔ والدین نے جسے بہتر سمجھا میرے لیے منتخب کر لیا، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے میں آج تمہیں یہاں صرف اتنا بتانے کے لیے آئی ہوں کہ میری شادی عنقریب ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ طے پا گئی ہے، اب وہ میرا مستقبل ہے۔ اگر تم نے واقعی مجھے دل سے چاہا ہے میرے لیے تمہارے دل میں ذرا سی جگہ بھی ہے تو پلیز ان سے اپنی دشمنی ختم کر دو سنعان، اگر تم مجھے ہنسا دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو، تو پلیز ان کو نقصان پہنچانے کے متعلق سوچنا چھوڑ دو، ایلاں شاہ کے بعد اب مجھے کسی اور کے لیے مت رونے پر مجبور کرنا پلیز.....“

رف چلیے میں ملبوس تھکی ہوئی سرخ آنکھوں میں آنسو بھرے وہ کتنے ضبط کے عالم میں اس سے کہہ رہی تھی جب بھر بھری ریت کی مانند ڈھس کر مسمار ہوتے ہوئے، سنعان شاہد کے انداز

دفاع میں ہاتھ اٹھا کر روکنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کر رہا تھا۔

یقیناً وہ لوگ ساتھ والے گاؤں کے چوہدری سے کوئی تعلق رکھتے تھے۔ انزلہ جب تک اس حقیقت کو سمجھتی سمعان بہت بری طرح سے گھائل ہو چکا تھا۔ تب اچانک اس کے حواس ایک دم سے بیدار ہوئے تھے۔ بہت بری طرح سے چلاتے ہوئے اس نے سمعان سے کہا تھا۔ ”سمعان..... پلیز ان سے فائیٹ کرو تمہیں میری قسم، انہیں اتنا ہی گھائل کرو، جتنا انہوں نے تمہیں کیا ہے۔“

انزلہ کے کہنے کی دیر تھی کہ چپ چاپ مار کھاتا، سمعان علی شاہد شدید گھائل ہونے کے باوجود ان تینوں پر بھاری پڑ گیا، وہ کتنا قوی تھا لڑائی کے کتنے داؤ بیچ جانتا تھا، یہ انزلہ کو آج معلوم ہوا تھا، تبھی ان تینوں نقاب پوشوں کے بھاگ جانے کے بعد وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی تھی اور پھر اس کے مضبوط کندھے پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”سنی..... سنی میں تم سے پیار کرتی ہوں، میں تم سے ہٹ کر کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ تم پتھر ہو سکتے ہو۔ مگر میرا دل پتھر کا نہیں ہے تم چاہے مجھے کوئی اہمیت نہ دو مگر میں تمہارے ساتھ ہی جینا مرنا چاہتی ہوں سمعان، مجھے ساتھ والے چوہدریوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچاؤ پلیز.....“

سک سک کر روتے ہوئے وہ بلا آخر اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی، مگر سمعان پر اب بھی اس کی ریکویسٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے گھر والوں کی طرح میں بھی مر جاؤں، اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، ان ظالم چوہدریوں کے ہاتھوں سک سک کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں۔“

گالوں پر بکھرتے آنسوؤں کو بے دردی کے ساتھ رگڑتے ہوئے اس نے اچانک اپنے لہجے کو بدلا تھا، جس پر سمعان شاہد کی آنکھوں کا اضطراب ایک دم سے بڑھ گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنے کہے پر عمل کرنے کی غرض سے اٹھ کر کچھ فاصلے پر بنے کنوئیں کی طرف دوڑ گئی۔ ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی دھن سمائی تھی کہ اتنے اچھے انسان کو ہر صورت ضائع ہونے سے بچانا ہے۔ خواہ اس کے لیے اسے سچے اپنی جان سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

سمعان نے کن آنکھوں سے اسے پرانے کنوئیں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ دل مضطرب کی شوریدہ دھڑکنیں پہلو میں اودھم مچا رہی تھیں۔ اعصاب ایک دم سے جیسے تن گئے

تھے۔ ضبط سے بھنچی مٹھیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ ایک ایک کر کے ضبط کے تمام خول جیسے چٹنے لگے تھے۔ یہ وہ لڑکی تھی جسے ہمیشہ زندگی کے ہر لمحے برے پل میں اس نے یاد رکھا تھا۔ جو ہمیشہ دھڑکن بن کر اسے اپنے دل میں دھڑکتی محسوس ہوئی تھی۔ جسے وہ آج بھی بے حد بے حساب پیار کرتا تھا۔ دل کے دوراہے پر آج درد اور محبت ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ وہ محبت کو کمزوری بنا کر بزدلی سے جینا نہیں چاہتا تھا، پھر سے زندگی کا ہاتھ تھام کر ماضی کی بے رحمیوں کو فراموش کرنا نہیں چاہتا تھا، مگر پھر بھی انزلہ شاہ کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اسے اپنے اندر پھر سے سناٹے اترتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سحرش اور ذیشان رحمانی کی رحلت کو دو ماہ ہو گئے تھے، مگر سبعین الہدی کی ٹھہری ہوئی اداس زندگی میں پھر جیسے کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ سفید لٹھے کی مانند تنے ہوئے چہرے پر جامد خاموشی آکر جیسے ٹھہر گئی تھی۔ بڑی بڑی غزالی نگاہوں میں ایک عجیب سا درد کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ کم گو تو وہ پہلے ہی تھی، مگر اب تو جیسے گوئی بھری ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے بھائی اور بھابھی کی موت پر وہ یوں بلک بلک کر روئی تھی کہ مضبوط دل و دماغ والے شانزل علی شاہ سے بھی اسے اور خود کو سنبھالنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔

پچھلے دو ماہ سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ نمکین آنسوؤں کا مرکز ہو کر رہ گیا تھا۔ سارا دن وہ گھر سے باہر گزرتا، رات میں دیر سے واپس لوٹتا تو اکثر کمرہ بند کر کے سحرش کی تصویر کو سینے سے لگا کر بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا۔ پچھلے صرف دو ماہ میں اس کی صحت اچھی خاصی ڈاؤن ہو گئی تھی اور ان حالات میں محض زویا خان کی بے لوث ذات تھی جو اسے پورے خلوص سے سنبھالے ہوئے تھی۔

اس روز بھی وہ اپنے ویران سے لان میں بیٹھا، پیاس بھری نگاہوں سے، بے حال پھول پودوں کو دیکھ کے بے ساختہ سحرش رحمانی کو یاد کرتے ہوئے سک پڑا، تو قریب سے گزرتی سبعین الہدی اس پر چوٹ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”اب یہ فضول آنسو بہا کر کسے دکھا رہے ہو مسٹر شانزل علی شاہ اپنی بہن اور میرے بھائی کی موت کے ذمہ دار آپ خود ہیں، ناں آپ فیصل شہزاد احمد کو موت کے منہ میں دھکیلتے نہ انہیں یوں ایمر جنسی خراب موسم کے باوجود پاکستان آنا پڑتا اور نہ ہی یوں اس طرح سے ان کی ذیبتہ ہوتی، مکافات عمل شاید اسی کو کہتے ہیں، دیکھ لیجیے، میرے لیے دکھا کٹھے کرتے کرتے،

آج آپ خود دکھوں میں گھر کر رہ گئے ہیں۔“ سفید کاشن کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس وہ اپنے زہریلے الفاظ کا زہر اس کی سماعتوں میں انڈیل رہی تھی، جب وہ ایک دم سے ایموٹنل ہو کر چلا اٹھا۔
”بس..... آگے ایک لفظ مت کہنا سبعین الہدیٰ، وگرنہ میں اپنا اختیار کھو بیٹھوں گا۔“

شدت ضبط سے غلافی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں، مگر سبعین الہدیٰ نے اس کے حال کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے اسی انداز میں کہا۔

”سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے، مگر نگلنا پڑتا ہے مسٹر..... اب آپ کو معلوم ہوگا کہ دل پر درد کا بوجھ گرا ہو تو زندگی کو گھسیٹ کر جینا، کس طرح دشوار ہوتا ہے۔“

اپنی بات کہنے کے بعد وہاں رکی نہیں تھی، بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں عین اسی وقت دل کش سی زویا خان اپنی شاندار گاڑی سے اتر کر ”شاہ پیلس“ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سبعین الہدیٰ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے بڑے خلوص سے اسے سلام کیا تھا، مگر سبعین بے رخی سے منہ پھیر کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

زویا اندر لان کی طرف آئی تو شانزل زمین پر بیٹھا بری طرح سے ہلک ہلک کر رو رہا تھا۔ زویا نے اسے اتنا کمزور اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے نہیں دیکھا تھا، زندگی کے بڑے سے بڑے حادثے کو وہ بڑی مردانگی کے ساتھ فیس کیا کرتا تھا، مگر یہاں اس مرحلے پر آکر وہ ہمت ہار گیا تھا، تبھی شاید وہ تڑپ کر تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچی تھی۔

”شانزل..... شانزل آریو او کے.....؟“ اپنے سرد ہاتھ اس کے مضبوط کندھوں پر جماتے ہوئے جونہی اس نے پوچھا وہ مزید کھمکھ کر رہ گیا۔

”زویا..... زویا میں مر کیوں نہیں جاتا، وہ کہتی ہے کہ میں اپنی بہن کی موت کا ذمہ دار ہوں، میں اس کی بربادیوں کا ذمہ دار ہوں، اگر ایسا ہے تو پھر میں زندہ کیوں ہوں؟ مجھے موت کیوں نہیں آتی زویا.....“ شانزل علی شاہ کے ان الفاظ پر بے لوث سی زویا خان کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔ تبھی وہ اپنے ہاتھوں سے اسے بکھرتے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”سبعین، گہرے صدمے کی وجہ سے اپنے حواس کھو بیٹھی ہے شان، اسے صحیح غلط کی پہچان نہیں رہی ہے، آپ خود کو سنبھالو پلیز، مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جا رہی۔“ شانزل کے بکھرتے آنسو پونچھتے پونچھتے وہ خود رو پڑی، تو ناچار اسے خود کو سنبھالنا پڑا۔

”زویا..... سحرش کو ان پھول پودوں سے بہت محبت تھی، ہر روز وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے پانی دیا کرتی تھی جب بھی کسی شاخ پر کوئی نیا پھول کھلتا، یا کوئی نوخیز کوئیل پھوٹی، وہ بے انتہائی

خوشی کے ساتھ دوڑتی ہوئی میرے پاس آتی تھی، مجھے زبردستی میرے کمرے سے نکال کر یہاں لان میں کھینچ لاتی تھی، آفس میں ہوتا تو ایمر جنسی فون کر کے بلوا لیتی تھی، مجھے یہ سب کچھ دکھائے بغیر اسے چین ہی نہیں ملتا تھا۔ آخر ماما کی رحلت کے بعد میں نے ہی تو اپنی آغوش میں سمیٹا تھا اسے مگر..... مگر دیکھو نا زویا آج وہ نہیں ہے تو اس کے لگائے ہوئے یہ خوبصورت پھول پودے بھی اپنی موت آپ مر گئے ہیں کسی نے ان کی طرف توجہ کیوں نہیں کی زویا، پلیز اسے واپس بلاؤ، اسے واپس بلاؤ زویا، اسے کہو کہ آکر اپنے پھول پودوں کی خود دیکھ بھال کرے، اسے کہو زویا کہ پچھلے دو ماہ سے کسی شاخ پر کوئی نئی کوئیل نہیں پھوٹی ہے، پلیز اس سے کہو نہ زویا، پلیز.....“

اب کے زویا خان کے ہاتھوں پر چہرہ نکا کر وہ اپنا رہا سہا اختیار بھی کھو بیٹھا تھا۔ تبھی شاید زویا خان نے اسے متاع کل کی مانند سمیٹتے ہوئے بھیگتے لہجے میں کہا۔

”آپ نے خود ہی تو سب کو منع کیا تھا کہ کوئی آپ کی اجازت کے بغیر یہاں کسی پودے کی کانٹ چھانٹ نہ کرے، سحرش کے بعد آپ ہی تو ان پھول پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں شانزل، پھر کسی اور کی بے نیازی کا گلہ کیوں..... آئیے ہم آج ہی سے اپنا کام دوبارہ شروع کرتے ہیں، پھر سے سحرش کے لگائے ہوئے ان پھول پودوں کو زندگی دان کرتے ہیں، ہم اسے خود سے شکوہ کرنے نہیں دیں گے شان، پلیز ہمت سے کام لیجئے، ہم ابھی اس لان کو پھر سے پہلے کی طرح شاداب کر دیں گے۔“

زویا خان کے الفاظ ہمیشہ اس کے نڈھال اعصاب کے لیے ٹھنڈی پھواری کی مانند ثابت ہوئے تھے۔ وہ اس کی قربت سے ہمیشہ بہل کر سنبھل جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ بہل کر سنبھل گیا تھا مکمل تندہی کے ساتھ زویا خان سے مل کر لان کے پھول پودوں کی صفائی میں مصروف ہو گیا تھا۔ زندگی کی پرتھکن راہ گزر پر یقیناً اسے ایک ایسی ہی ہمسفر کی اشد ضرورت تھی، جو اس کے دل کا درد بانٹ کر اس کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹوں کے پھول کھلا دیتی، ہر فکر و رنج سے دور کر دیتی اسے اور بلاشبہ خدا نے ایک اپنی قدرت سے زویا خان کے روپ میں ایک ایسی ہی ہمسفر اسے عطا کر دی تھی۔

☆☆☆

محبت سلطنتِ دل کی.....

طلمس ذات بھی ہے یہ

تخلیل کا نشہ ہے تو، دکھوں کی رات بھی ہے یہ

محبت کا ہر اک جذبہ تمہارے نام کرتی ہوں
یہی آغاز ہے دن کا یہیں یہ شام کرتی ہوں
نوائے شوق کی شدت کہیں تھوڑی جو کم ہوگی

تمہاری بے وفائی سے.....

اگر یہ آنکھ نم ہوگی

کسی اگلی جدائی کا

نہ تم پر بار ڈالوں گی

تمہیں میں مار ڈالوں گی

تمہیں میں مار ڈالوں گی

”رک جاؤ انزلہ..... تمہیں اپنے سنعان شاہد کی قسم۔“

ضبط کی آخری حد سے پھسل کر اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگائی، انزلہ شاہ کو پکار کر روکا تھا۔ جواب میں وہ پرانے کنوئیں کی منڈر پر دونوں ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے اپنے اکھڑتے ہوئے سانس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ سنعان شاہ جیسے تھک کر وہیں ڈھس گیا تھا۔

”میں زندگی میں سب کچھ کھو چکا ہوں انزلہ سب کچھ گنوا دیا ہے میں نے، سب کچھ اپنا گھریا اپنے ماں باپ بہن بھائی اپنے جذبہ اپنی انسانیت اپنا وقار اپنی تعلیم کچھ بھی تو نہیں رہا ہے میرے پاس میں نے زندگی کو خدا کی امانت سمجھ کر جینا چھوڑ دیا ہے انزلہ زندگی اب مجھے جی رہی ہے، مجھ سے کھیل رہی ہے، مگر پھر بھی میں اپنی موت سے پہلے تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

”مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے تم کون ہو؟ ایسے کیوں ہو؟ میں نہیں جانتی، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے جس سنعان شاہ کو اپنی زندگی سمجھا تھا، وہ اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا، مگر آج..... آج وہ واپس لوٹ آیا ہے سنی، آج اس نے اپنی انزلہ کو مرنے سے روک لیا، اور یہ سر پھری انزلہ شاہ، یہ بس محض اسی کی قسم پر رکی ہے ورنہ تم لاگھ اپنی طاقت آزما لیتے، آج اس انزلہ شاہ کو مرنے سے نہیں روک سکتے تھے۔“

منتشر سانسوں کو بحال کرتی وہ اس کے مقابل آئیٹھی تھی۔ تبھی شاید اس نے ہارے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

”تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں ہتھیار بھیج کر، پھر سے بزدلی کی زندگی جینا شروع کروں،

تاکہ کل کو پھر کوئی چوہدری آکر میری زندگی میں آگ لگا دے، مجھے تباہ و برباد کر دے۔“

انزلہ شاہ کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے بھی خون چھلک رہا تھا۔ کشادہ پیشانی پر بکھرے بال بہتے ہوئے خون سے چپک گئے تھے۔ انزلہ شاہ نے محض ایک نظر سر اٹھا کر اس کے زخمی وجود پر نگاہ ڈالی تھی، پھر جانے من میں کیا آیا کہ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آہستی سے سنعان علی شاہد کے چوڑے سینے پر رکھ دیا۔

”ہم اب وہ راہ گزر چیں گے سنعان کہ جس پر چل کر ہر کام صرف بھلائی کا ہوگا،

ہم اب یہاں دوبارہ کسی چوہدری کو پیدا نہیں ہونے دیں گے، یہاں پاکستان میں ہر بندہ

حکمرانی کا طالب ہے، اپنے سے کمتر کو دبا کر سکون محسوس کرتا ہے، خدا کی زمین پر ناخدا ہوتے

ہوئے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، ہنستی کھیلتی زندگیوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہاں بہت سے دیہات

ایسے ہیں سنعان جہاں کوئی نہ کوئی چوہدری، کسی نہ کسی سنعان شاہد پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے،

جہاں تعلیم منہ چھپائے رو رہی ہے، زہریلی رسمیں فروغ پا کر انسانیت کو خون کے آنسو روئے پر

مجبور کر رہی ہیں، جہاں زندگی تھک رہی ہے سنعان، مگر..... آج تک کوئی بھی سنعان شاہد

بندوق اٹھا کر ان برائیوں کو جڑ سے ختم نہیں کر سکا ہے سنعان، کسی وزیر مشیر کے پاس اتنی

فرصت نہیں ہے کہ وہ محض چند لمحوں کے لیے ہی آکر ان دیہاتوں میں رلنے والی زندگیوں کے

اوراق پلٹ کر دیکھ لے، درد سے چور دلوں کا دکھ سن لے، کرب سے برستی بے بس آنکھوں کے

آنسو پونچھ دے، ہم سب مر گئے ہیں سنعان، نفسا نفسی اور بے حسی۔ کب زہر نے ہم سب کو مار کر

پتھر کا بنا دیا ہے، اب ہم پر اچھے برے موسم اثر انداز نہیں ہوتے، کسی کی سسکیاں کسی کا ضمیر زندہ

نہیں رہا ہے سنعان، ہم سب بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر ایک دوسرے کا گوشت نوچ رہے ہیں، حرام کھا

رہے ہیں اسی لیے تو اللہ نے ہم سب سے ناراضگی کا اظہار دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اسی لیے تو

ہم پر آفتیں ٹوٹ رہی ہیں؟ جب مرجانا ہی مقدر ٹھہرا، تو کیوں نہ اس معبود حقیقی کے سامنے سرخرو

ہو کر مر میں سنی، کہ جس نے ہم سب پر اپنا خاص کرم فرماتے ہوئے ہمیں اپنے پیارے محبوب محمد

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا فرمایا۔ بولو سنعان، کیوں نہ ہم وہ راستے ہی بند

کر دیں، جو ہمارے اس معاشرے میں جانے کتنے ہی بے بس نوجوانوں کو غلط منزل تک لے جا

رہے ہیں، جب مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں نہ اس زندگی کو کسی کی بھلائی کے لیے وقف کر دیں،

کیوں نہ امر ہو جائیں سنعان، کیوں نہ سب میں زندگی کا شعور، پھر سے بیدار کر دیں۔“

سنعان کے سینے پر ہاتھ رکھے، وہ کہہ رہی تھی، جواب میں وہ کرب سے پلکیں

موندتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

”کیا کرنا چاہتی ہو تم.....؟“

”بھٹکے ذہنوں کو راہ راست پر لانا چاہتی ہوں، گمراہ لوگوں کی درست رہنمائی کرنا چاہتی ہوں میں۔“

”نہیں کر سکو گی، تم چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکو گی انزلہ، کیوں کہ جب بھی تم اپنے ان احساسات کو ذہن کے در پیچے سے نکال کر عمل کی دہلیز پر لاؤ گی، تمہیں مار دیا جائے گا، تمہارے اپنے ہی آزاد وطن میں تمہارے اپنے ہی لوگ تمہیں مار دیں گے، کسی سڑک پر چلتے ہوئے کسی ان دیکھی گاڑی کے نیچے آ کر پکلی جاؤ، کسی انجانی سمت سے آتی ہوئی گولی سینے پر کھا کر مر جاؤ گی، انزلہ کسی طاقتور ہم کے کہیں پھٹنے سے تمہاری موت ہو جائے گی، یہاں کوئی تمہیں سچائی کی راہ پر چلتے نہیں دے گا، حکمرانی کے نشے میں چور یہ لوگ تم سے تمہاری زندگی کو چھین لیں گے انزلہ مار ڈالیں گے تمہیں۔“

انزلہ نے پہلی بار اسے یوں دیکھا تھا۔ تبھی دل گرفتگی کے عالم میں اس کا زخمی ہاتھ اپنے رخ ٹھنڈے ہاتھوں میں لے کر پھیک سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

”جب مرجانا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں ناسچائی کی راہ گزر پر چلتے ہوئے موت سے ہاتھ ملائیں سنعان بزدلوں کی طرح جان بچانے کے لالچ میں گیدڑ کی سو سالہ زندگی جینے سے کہیں بہتر ہے کہ سونے والوں کے مردہ ذہن جگا کر شیر کی طرح ایک دن کی زندگی جی لی جائے تاکہ کم از کم مرنے کے بعد ہماری جھولی میں کوئی تو ایسی چیز ہو جو ہمارے رب کے سامنے ہمیں سرخرو کر دے اور پھر..... تمہاری گود میں سر ہو، میرا یہ کمزور بدن تمہاری مضبوط پناہوں میں ہو، نزع کے وقت ان آنکھوں کے سامنے تمہارا چہرہ ہو، تو خدا کی قسم سنعان میں سو بار مرنے سے بھی انکار نہ کروں۔“

اس وقت اس کی آنکھوں میں جو پیاس تھی اس نے سنعان شاہد پر چڑھتے مضبوطی اور بے حسی کے خول کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ٹوٹا نہیں چاہتا تھا، مگر انزلہ شاہ نے بالآخر اسے قطرہ قطرہ کر کے توڑ ڈالا تھا۔ تیز سیلاب کی مانند اس کی محبت کا بہاؤ اس مضبوط درخت کو جڑ سمیت اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا، انزلہ اب اپنے بھٹکے آنچل سے اس کے رستے ہوئے زخم صاف کر رہی تھی اور وہ تھکا تھکا سا بیضا، یک ٹک مکمل انہماک کے ساتھ اس کی آنکھوں میں تیرتا، اپنا عکس دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

محبت کے سمندر میں

یہ تپتا جون آیا ہے

تمہارا خط نہیں آیا، نہ کوئی فون آیا ہے

تو کیا تم کھو گئے ہو اجنبی لوگوں کے جنگل میں

مسافر مل گیا کوئی

نئے رستوں میں منزل میں

خیال وعدہ برباد بھی..... نہیں آیا

تو کیا میں تم کو کبھی یاد بھی نہیں آیا

بہت سا وقت چپ چاپ بیت گیا تھا۔ اس دوران میں سبعین الہدیٰ کو بہت دنوں

تک دھکے کھانے کے بعد بالآخر ایک کمپنی میں مناسب سے عہدے پر فائز ہونے کا اعزاز مل گیا

تھا۔ شانزل نے کتنا چاہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے آفس میں کام کرے مگر اس نے نہایت

درستگی سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ اس کی بھیک، ہمدردیوں پر جینا نہیں چاہتی۔

اس کی بیٹی اب آٹھ سال کی ہو گئی تھی۔ سبعین الہدیٰ آفس سے لوٹنے کے بعد تمام

وقت اسی کے ساتھ گزارتی تھی شانزل علی شاہ اور اس ننھی سی پری کا پیار بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

وہ جب تنہا یا اداس ہوتا تو ننھی معطر کی باتیں اس کا خوب دل بہلایا کرتی تھیں۔ ہنسا قہقہے لگاتا،

زندگی کو انجوائے کرنا، خواب دیکھنا، تو وہ جیسے بھول ہی چکا تھا۔ ایک عجیب سی چپ اس کے لبوں

پہ آ کر ٹھہر گئی تھی۔ سبعین الہدیٰ سے اب بھی اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ تاہم اس روز، جب

وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا، زویا خان سے موبائل پر بات کر رہا تھا تو زندگی میں دوسری بار

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو زویا کی خوبصورت باتوں میں مگن شانزل علی شاہ ایک دم

سے جیسے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ پہلو میں دھڑکتا دل بہت زور سے مچلا تھا۔ جانے کیسے مخاطب ہو اس

کے ساتھ، اس نے آہستگی سے زویا خان کو ایکسکیوز کرتے ہوئے موبائل آف کیا تھا۔

”تم یہاں..... اس وقت، خیریت تو ہے.....؟“

اسے واقعی اپنے کمرے میں شام کے وقت دیکھ کر وہ چریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا، مگر

سبعین الہدیٰ نے اس کی پریشانی سے مکمل طور پر نگاہیں چراتے ہوئے خاصے خشک لہجے میں کہا۔

”جی خیریت ہی ہے، اصل میں آپ کے کچھ واجبات ادا کرنے تھے سو وہی لوٹا نے

چلی آئی۔“

”واجبات..... کیسے واجبات.....؟“ اسے واقعی حیرانگی ہوئی تھی۔

”اپنے شوہر کی وفات کے بعد دل پر جبر کر کے بمشکل ہی سہی، مگر پچھلے آٹھ دس ماہ سے میں آپ کے اس محل سے گھر میں ایک کمرے میں رہ رہی ہوں، چوں کہ میں اپنی جان پر آپ کا کوئی احسان لے کے جینا نہیں چاہتی لہذا پچھلے ایک سال کا کرایہ اپنے حساب سے آپ کو ادا کرنے آئی ہوں، یہ لیجیے۔“

اس کے الفاظ پر چند لمحوں تک وہ حیرانگی سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر ایک دم سے ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سبعین الہدی نے اس وقت قدرے خفگی سے گھور کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اوگاڈ..... میں تو یہ بھول ہی چکا تھا کہ آپ پچھلے ایک سال سے یہاں میرے گھر کے ایک کمرے میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہ رہی ہیں، ٹھیکس کہ آپ نے یاد دلا دیا، آپ کی خود داری کی داد دینی پڑے گی، مگر..... افسوس مس سبعین، کہ آپ ابھی بھی بہت کچھ بھول رہی ہیں، چلو خیر کوئی بات نہیں، میں یاد دلا دیتا ہوں۔“

اس کے حیران حیران سے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا، پھر سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔

”دیکھئے مس سبعین، چوں کہ آپ اپنی جان پر میرا کوئی احسان لے کر مرنا نہیں چاہتیں، لہذا میری یہ خواہش ہے کہ آج سارے حساب بے باک ہو جائیں۔“

پل دوپل کے لیے اس نے پھر رک کر اس کے خوبصورت چہرے پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔

”فٹ آف آل، آپ کے شوہر مسٹر فیصل شہزاد احمد نے یہاں قیام کے بعد اپنا ڈوبتا ہوا برنس سنبھالنے کے لیے مجھ سے بیس لاکھ روپے بطور قرض لیے تھے، جن کی تاحال واپسی نہیں ہو سکی ہے ویسے اس وقت وہ آپ کے تمام زیورات لے کر آئے تھے میرے پاس، مگر میں نے انہیں قبول کرنا مناسب نہیں سمجھا، لہذا محض آپ کے صدقے انہیں بیس لاکھ روپے کی خطیر رقم بطور قرض دے دی، اس کے بعد اگر اس قدر شاندار محل میں رہنے کا ماہانہ کرایہ پانچ ہزار روپے بھی لگا یا جائے تو یہ رقم سالانہ ساٹھ ہزار روپوں کے لگ بھگ بن جاتی ہے، روزانہ کھانے پینے، بجلی گیس وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی کی رقم اس کے علاوہ ہے، یوں آپ پر کل جو رقم لاگو ہوتی ہے وہ تقریباً بیس لاکھ اور اسی نوے ہزار کے قریب بن جاتی ہے، آپ کتنی رقم کی ادائیگی کرنے آئی ہیں مجھے.....“

سبعین الہدی کے لیے اس کا یہ انداز یہ الفاظ شاکہ کر دینے کے لیے کافی تھے۔ بھلا پہلے کب ایسا رویہ اپنایا تھا اس نے سبعین کے ساتھ، تبھی وہ شدید ندامت میں گڑی، پچھلے چار پانچ ماہ سے پائی پائی کر کے جمع کی ہوئی، دس ہزار کی رقم مٹھی میں بھینچ کر، آنکھوں میں امد آنے والے آنسو چھپانے کی خاطر فوراً سر جھکا گئی۔

”اب آپ جاسکتی ہیں مس سبعین، اور آئندہ یوں بناء اجازت میرے بیڈروم میں آنے کی گستاخی بھی مت کیجیے گا، باقی میں اپنے اسٹنٹ کو سمجھا دوں گا، آپ روپے پیسے کے لین دین کے معاملات آئندہ ان کے ساتھ ہی طے کر سکتی ہیں۔“

اف کس قدر حقارت تھی اس کے لہجے میں کہ سبعین الہدی لمحوں میں پسینہ پسینہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت وہ شانزل علی شاہ کے بیڈروم سے اپنے کمرے میں آئی تو آنسوؤں پر سے اس کا اختیار اٹھ چکا تھا۔ بیڈ پر گر کر بلک بلک کر روتے ہوئے وہ اپنے نصیب سے خوب گلہ کر رہی تھی۔ بھری دنیا میں کوئی ایک ہستی بھی تو ایسی نہیں رہی تھی، جو اس کے آنسو پونچھتی، اسے دلا سہ دیتی، اس کی ڈھارس بندھاتی معطر سکول سے گھر واپس آئی تو دونوں بازو آنکھوں پر رکھے یونہی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

”مما..... کیا ہوا.....؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟“

قطعاً تشویش سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بیک ٹیبل پر رکھ کر سیدھی اس کی طرف لپک آئی تھی۔ جواب میں اس نے اپنی سرخ آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”ہاں بیٹے بس یونہی تھوڑا سا درد کر رہا تھا، آپ سناؤ، آج کا دن کیسا رہا سکول میں۔“

”اچھا رہا، پر آپ روئی کیوں ہیں؟“

وہ اس کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس تھی۔ تبھی اس کی سرخ آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو سبعین اچھی خاصی گڑبڑا کر رہ گئی۔

”کچھ نہیں بیٹے..... بس یونہی آپ کے ماموں، ممانی کی یاد آگئی تھی۔“

معطر کے سلکی بالوں میں، محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے فورا بہانہ بنایا

جواب میں وہ اس سے مزید لپٹتے ہوئے پیاس بھرے لہجے میں بولی۔

”پھر تو شان انکل بھی خوب روتے ہوں گے ممما، آخر انہوں نے بھی تو اپنی بہن کو

کھویا ہے، وہ کس سے اپنے دل کا حال کہتے ہوں گے، ان کے آنسو کون پونچھتا ہوگا ممما.....“

”آپ کو ان کے لیے کچھ بھی سوچ کر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے

کے آنسو پونچھنے والے بہت ہیں۔“

قدرے درشت لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر آئی تھی۔ اگلے کچھ روز میں اس نے رحمت بواء سے کہیں اور شفٹ ہونے کے متعلق بات کی تو انہوں نے نہایت دو ٹوک لہجے میں اسے ایسا کوئی قدم اٹھانے سے روک دیا۔

”زمانہ بہت خراب ہے بیٹی، مردوں کے اس معاشرے میں ایکلی عورت کا کسی پرانے گھر پر رہنا، کسی بھی قسم کے خطرے سے خالی نہیں ہے، پھر یہاں تمہیں کیا مسئلہ ہے، شانزل بہت اچھا بچہ ہے، بچپن سے جانتی ہوں میں اسے میری ہی گود میں پل کر جوان ہوا ہے وہ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے بیٹی۔“

بلاشبہ رحمت بواء نے اس سے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست تھا، تبھی اس نے فی الحال کسی اور جگہ اپنے شفٹ ہونے کے ارادے کو ملتوی کر دیا۔

شانزل علی شاہ کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت تھی، لہذا اس نے اوور ٹائم جاب کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے تھے۔ شب و روز کی محنت نے اسے اندر سے تھکانا شروع کر دیا تھا۔ اوور ٹائم جاب کے بعد تو اس کے پاس معطر کے لیے ٹائم نکالنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ شانزل علی شاہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے بظاہر چپ چاپ اس کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس روز وہ آفس سے ہاف ڈے کے باعث ذرا جلدی گھر لوٹ آئی تو معطر نے باہر سیر کی فرمائش کر دی، ناچار اسے اس کے ساتھ قریبی پارک تک آنا پڑا۔

مگر یہاں آکر وہ مزید کوفت کا شکار ہو گئی، کیوں کہ نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر شانزل علی شاہ نیچے گھاس پر زویا خان کے سامنے بیٹھا، ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں شاید کچھ کھا رہے تھے۔ لہذا سببیں نے فوراً اسے پیشتر نگاہوں کا رخ پھیر لیا تھا، مگر معطر انہیں اپنے سامنے پا کر سببیں کے پاس نہیں رک سکی تھی۔ تبھی فوراً بھاگ کر وہ شانزل کی گود میں جا بیٹھی تو سببیں اپنی جگہ شپٹا کر رہ گئی۔ شانزل علی شاہ نے معطر کی نشاندہی پر ایک بڑی سرسری نگاہ اس کی سمت ڈالی تھی اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ سببیں کو اپنا یوں بری طرح سے نظر انداز ہونا بہت برا لگا تھا، تبھی شاید وہ اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہاں سے اٹھ کر پارک سے باہر نکل آئی تھی۔

”شان..... کل میری برتھ ڈے ہیں، اس بار آپ مجھے کیا تحفہ دیں گے؟“

سببیں الہدی سے قطعی بے نیاز زویا خان اپنے مقابل بیٹھے شانزل علی شاہ سے پوچھا تھا، جواب میں وہ اپنی گود میں بیٹھی معطر کے ننھے ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”اس بار تمہاری سالگرہ پر، میں تمہیں اپنا آپ دان کر رہا ہوں زویا، اس کرب انگیز زندگی کی کالی راتیں اور سنگتے دن اب تمہا بسر نہیں ہوتے..... میں کل ہی آئی سے مل کر ان سے ہماری شادی کے متعلق بات کرتا ہوں۔“

اس کے خوبصورت الفاظ پر زویا خان کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ سفید رخسار جیسے متمنا اٹھے تھے۔ ایک شرنگیں سی مسکراہٹ خوبصورت عنابی لبوں پر آکر جیسے ٹھہر گئی تھی۔ شانزل علی شاہ نے کس قدر دلچسپی کے ساتھ یہ خوبصورت نظارہ دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

آج کل اس کا زیادہ وقت زویا خان کی ہمراہی میں ہی بسر ہو رہا تھا۔ دونوں مل کر مستقبل کے ڈھیروں پلان بناتے، کبھی وہ ڈیپریس ہوتا تو زویا اس کا سراپنی گود میں رکھ کر آہستگی سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں گھماتی، جس سے اسے بے حد سکون ملتا۔ شانزل کے کمرے کو سنوارنا، اس کا دل چاہنے پر اس کے لیے مزے مزے کی ڈشز بنانا، رات میں دیر تک اس کے ساتھ بیٹھ کے کپ شپ لگانا، اکٹھے شاپنگ کے لیے جانا، آؤٹینگ کے لیے جانا، زویا نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ ان دنوں وہ اتنی خوش رہنے لگی تھی، کہ اس کا چہرہ دھنک رنگ سادیکھائی دینے لگا تھا۔

اسی روز رات میں شانزل آفس سے جلدی گھر آ گیا، تو معطر، سببیں کو کام میں مصروف دیکھ کر، قدرے بوریت محسوس کرتے ہوئے چپکے سے شانزل کے بیڈروم میں چلی آئی۔

”ارے..... آپ اس وقت یہاں.....“ کیا بات ہے ماما سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟“

قدرے حیرانگی سے پلٹ کر، اسے اپنی بانہوں میں اٹھاتے ہوئے شانزل نے پوچھا تو وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”نہیں، ماما مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں، وہ مجھ سے تو کیا، کسی سے بھی جھگڑا نہیں

کر سکتیں۔“

”نہیں..... یہ جھوٹ ہے، وہ مجھ سے تو بہت جھگڑتی رہتی ہیں۔“ شانزل نے بھی فوراً مسکرا کر اس کے یقین کو جھٹلایا، پھر اسے اپنی گود میں لے کر بیڈ پر آ بیٹھا، تو معطر نے پوچھا۔

”انکل ماما آپ سے غصے کیوں رہتی ہیں، آپ تو اتنے اچھے ہیں، مجھ سے اور ماما سے اتنا پیار کرتے ہیں، پھر بھی ماما آپ کے ساتھ خوش نہیں رہیں، کیوں.....؟ اب شانزل اس

”میری بے بسی کا فائدہ مت اٹھاؤ مسٹر شانزل تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔“

”ہاں مجھ سے زیادہ یہ جان بھی کون سکتا ہے، ویسے بھی تم جیسی مردہ دل پتھر لڑکی ہر کسی سے نفرت ہی کر سکتی ہے، محبت تمہاری سرشت میں کہاں؟ تمہارے پاس وہ دل ہی نہیں ہے جو اس لطیف جذبے کے احساس کو محسوس کر سکے۔“

”میں تم سے الجھنا نہیں چاہتی مسٹر شانزل برائے مہربانی آپ مجھ سے اور میری بیٹی سے دور ہی رہیں، تو بہتر ہے۔“ وہ پھر درنگی سے چلائی تھی مگر اس بار شانزل دھنسنے سے مسکرا اٹھا تھا۔

”یہی تو مصیبت ہے سویٹ ہارٹ کہ میں چاہ کر بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا، ویسے بھی تمہیں کوئی ایسے خطرناک جراثیم نہیں لگے جو میں تم سے دور رہ کر اپنی زندگی کی فکر کروں، اگر لگے بھی ہوتے تو خدا کی قسم تم سے دور جانے کا تصور تک نہ ہوتا۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں ادا ہونے والے الفاظ، سبعین الہدیٰ کو سرتا پیر جلا گئے تھے، تبھی وہ غصے سے دھاڑ اٹھی۔

”میں یہاں تمہاری بکواس سننے کے لیے نہیں آئی ہوں۔“

”اوسوری پہلے بتانا تھا ناں، میں تمہیں چائے پانی کا پوچھ لیتا۔“

اس کا تپا تپا سا سرخ چہرہ اسے بہت لطف دے رہا تھا۔ بھی وہ اسے تنک کیے گیا، تو سبعین ایک جھٹکے سے اپنی کلاٹھی اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

”ہاتھ چھوڑو میرا، میں تم جیسے گھٹیا انسان کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔“

”بد قسمتی ہے آپ کی، خیر میرا ٹیٹ بھی اتنا خراب نہیں ہے کہ استعمال شدہ چیزوں کو منہ لگاتا پھروں آپ جاسکتی ہیں محترمہ، مگر آئندہ احتیاط کیجیے گا، میں اپنے گھر میں دہشت گردی پسند نہیں کرتا۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے سبعین کی کلائی چھو کر، پینٹ کی پائکس میں دونوں ہاتھ ڈال لیے، تو سبعین اپنی جگہ تھملا کر رہ گئی، اپنی بے بسی اور تقدیر کی بے رحمی پر اسے پھوٹ پھوٹ کر رونا آ رہا تھا، مگر اس وقت وہ اس دشمن جاں کے سامنے رو کر خود کو کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی، لہذا اچھلکتے آنسوؤں کا زہر حلق میں اٹھاتی مسٹر کانزہ کو بازو تھام کر اسے اپنے کمرے کی طرف لے آئی۔

”کیوں گئی تھیں تم اس کے پاس؟ منع کیا تھا ناں میں نے کہ اس طرف نہیں جانا، پھر کیوں گئیں تھیں تم اس کی طرف۔“

دل میں ولولتا لاہو، معصوم بچی پر اٹھ لیتے ہوئے وہ زور سے دھاڑی تو ایک کرب انگیز

کے معصوم سے سوال کا کیا جواب دیتا، لہذا خاموش رہا۔

”انکل..... آپ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں، ممہ کی کسی بات کا بھی برا نہیں مناتے، کیوں.....؟ آپ ہمارے کیا لگتے ہیں؟“

پہلے سوال کی طرح معطر کے دوسرے سوال پر بھی وہ لب بھینچے خاموش بیٹھا رہا، کہنے کو پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

”انکل..... میری ممد دل کی بہت اچھی ہیں، خوب پیار کرنے والی، خیال رکھنے والی، کھانے بھی بہت مزے مزے کے بناتی ہیں رات میں بہت میٹھی لوری سناتی ہیں، ان کو بہت اچھی اچھی کہانیاں بھی سناتی آتی ہیں، آپ زویا آئنٹی کی بجائے ممہ سے شادی کر لیں ناں انکل، پلزز.....“

اب کے شانزل کا دل بہت برے طریقے سے دھڑکا تھا، ہونٹوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں بھی کپکپا اٹھے تھے۔ دل کے اندر جیسے اودھم مچ کر رہ گیا تھا، ایک عجیب سی بے کلی نے جیسے اس کی پوری روح کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ آنکھوں میں بلاوجہ ہی نمکین پانی اکٹھا ہو گیا تھا۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں زویا سے شادی کر رہا ہوں۔“ بھرائی آنکھوں کو رگڑ کر اس نے خاصے نم لہجے میں پوچھا تھا، جب وہ اپنے معصوم لہجے میں بولی۔

”آج پارک میں آپ زویا آئنٹی سے کہہ رہے تھے، تبھی میں نے سنا تھا۔“

”آپ کی زویا آئنٹی بھی تو اچھی ہیں بیٹے۔“ دل میں اودھم مچاتی دھڑکنوں پر بمشکل کنٹرول پاتے ہوئے اس کے حلق سے خاصی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

”ہاں زویا آئنٹی بہت اچھی ہیں، پر ممہ زیادہ اچھی ہیں زیادہ خوبصورت بھی ہیں۔“ اپنی معصوم عقل کے مطابق اس نے شانزل کو لالچ دینے کی کوشش کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ وہ جواب میں اس سے کچھ کہہ پاتا، سبعین خاصے غصے میں دنناتے ہوئے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”منع کیا تھا ناں میں نے، پھر کیوں آئی ہو تم اس طرف۔“ شانزل کی گود میں بیٹھی، نحی معطر کا بازو دوپوچتے ہوئے اس نے تقریباً چلا کر کہا تھا، جب شانزل نے فوراً اس کی نازک سی کلائی اپنی مضبوط گرفت میں تھام لی۔

”منع تو میں نے بھی آپ کو کیا تھا مس سبعین الہدیٰ کہ میری اجازت کے بغیر آپ میرے بیڈروم میں قدم نہیں رکھیں گی، مگر..... آج پھر آپ نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، لگتا ہے پیار کی زبان آپ کو سمجھ میں نہیں آتی ہے۔“

سبعین، کلائی، اس کا دباؤ خاصا بڑھا تھا، جب وہ غصے سے بھڑکتے ہوئے بولی۔

کسی جلتے شرارے کو، فنا کے استعارے کو
محبت روک سکتی ہے کسی گرتے ستارے کو
یہ چکنا چور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہے، محبت سے یہ باگیں موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

”تو تم نے قسم کھالی ہے کہ تم مجھے میری مرضی کے مطابق جینے نہیں دوگی..... ہے ناں۔“
انزلہ کی گود میں سر رکھے لیٹا۔ وہ اب مکمل پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی وہ اپنے
ہاتھوں سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

”ہاں جب تم نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر ہی دیا ہے، تو پھر میری مرضی کہ میں تمہاری
زندگی کو کس راہ پر ڈالتی ہوں اور پتہ ہے سعان یہ وطن ہمارا اپنا وطن ہے، ہماری سانوں ہمارے
دلوں کا رشتہ جزا ہے اس کے ساتھ، پھر ہم غیروں کی طرح اس کی بربادی کا تماشہ کیوں دیکھیں
سعان، گوئے بہروں کی طرح، بے بس غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر برائی کی پیروی کیوں کریں
کیوں نادبیے سے دیا جلائیں سعان کیوں نامل کر جہالت کے اندھروں کو ختم کریں ہم.....“
وہ بول رہی تھی اور سعان اس کی گود میں سر رکھے لیٹا، خاموشی سے اس کے عظام کو
سن رہا تھا۔

”پتہ ہے انزلہ..... آج ایک مدت کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں زندہ
ہوں۔ کوئی ہے جو میری فکر کرتا ہے، میرے لیے سوچتا ہے، میرا درد جسے تکلیف پہنچاتا ہے، اور
بس صرف ایک اُسی اپنے کے لیے میں پھر سے انسانیت کا چوندہ پہن رہا ہوں، تمہارا ہاتھ تھام کر
پرانی راہ گزر پر واپس پلٹ رہا ہوں، تم جیسے کہو گی میں ویسے ہی کروں گا انزلہ، مگر..... بدلے
میں تمہیں بھی مجھے کچھ دینا ہوگا۔“ اب چونکنے کی باری انزلہ کی تھی۔
”ماگو کیا مانگتے ہو۔“

بھر پور فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے خاصی سرشاری کے انداز میں کہا تھا،
جواب میں وہ اس کا نازک سا ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔
”مجھے اپنی سانوں کے بدلے تمہارا ساتھ درکار ہے انزلہ، مجھ سے وعدہ کرو کہ
مجھے انسانیت کی ڈگر پر دوبارہ گامزن کرنے کے بعد تم مجھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاؤ گی، چاہے
کچھ ہو جائے تم صرف میری رہو گی، زندگی کا ہر موسم ہر دکھ سکھ میرے ساتھ شیئر کرو گی۔“

سی ٹیس شانزل کے دل کو اپنی گرفت میں لے گئی۔ بڑی زخمی سی مسکراہٹ محض ایک پل کے
لیے اس کے ہونٹوں پر بکھری اور اگلے ہی لمحے گم ہو گئی۔

اس روز وہ بہت دیر تک جاگ کر سبعین الہدی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ رات بھر
سموکنگ کرتے ہوئے وہ اس کے ساتھ بیٹے، ایک ایک لمحے کو یاد کرتا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات
تھی کہ وہ اس کی بے تحاشا نفرت کے باوجود بھی اس سے نفرت نہیں کر پایا تھا۔ جتنا اسے دل
سے دربر کرنے کا سوچتا، اتنا ہی اس کے تصور میں الجھتا چلا جاتا تھا۔ دل کے رستے زخم تھے کہ
ادھر تے ہی چلے جا رہے تھے۔ زندگی ایک عجیب امتحان ہو کر رہ گئی تھی اس کے لیے۔

”آپ زویا آئی کی بجائے مماسے شادی کریں ناں انکل، پلیز.....“
معطر کی آواز قریب ہی کہیں گونجی تھی، تبھی وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں تکیہ دبا
کر، بے دلی سے بیڈ پر گر گیا۔ پہلو میں اودھم مچاتے دل کی منتشر دھڑکنوں پر قابو پانا، اس وقت
اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

کوئی زنجیر ہو آس کی، چاندی کی، روایت کی
محبت توڑ سکتی ہے

یہ ایسی ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا سکہ نہیں چلتا
اگر چشم تماشہ میں ذرا سی بھی ملاوٹ ہو
یہ آئینہ نہیں چلتا

یہاں ایسی آگ ہے جس میں
بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو روہیں مسکراتی ہیں
یہ وہ سیلاب ہے جس کو

دلوں کی بستیاں آواز دے کر خود بلاتی ہیں
یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے
دعا جو بے ٹھکانہ ہو اسے تاثیر ہو جائے
کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے
محبت روک سکتی ہے، سسے کے تیز دھارے کو

نے یہاں آپ کے کسی گولڈ کے سیٹ کو ہاتھ نہیں لگایا، میری بچی بیمار ہے میں اسی کے علاج کے لیے یہاں اپنی چوڑیاں بیچنے آئی تھی، خدا کے لیے مجھے جانے دیں پلیز، میں چور نہیں ہوں۔“

آنسوؤں کی آمیزش میں ڈوبا یہ لہجہ تو وہ کروڑوں میں بھی پہچان سکتا تھا، تبھی شاید اس کی سماعتیں برف ہوئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ایک دم سے جیسے بے جان ہو کر رہ گئے تھے، سن اعصاب کے ساتھ وہ اپنی جگہ پر کھڑا گویا فریز ہو کر رہ گیا تھا۔

”دیکھیں محترمہ، آپ کے علاوہ یہاں اس پورشن میں ایسا کوئی کسٹمر نہیں آیا کہ جس پر ہم چوری کا شبہ کر سکیں سیٹ ابھی غائب ہوا ہے، لہذا آپ کے علاوہ یہ کام اور کسی کا نہیں ہو سکتا، اب آپ شرافت سے نہیں مانیں گی تو مجبوراً ہمیں پولیس کو یہاں بلوانا پڑے گا۔“

لمحوں میں تمام صورت الحال شانزل علی شاہ کی سمجھ میں آ چکی تھی، تبھی وہ مزید ایک پل کی تاخیر کیے بغیر اس کی طرف لپکا تھا۔

”ایکسیکوزی۔“

شانزل علی شاہ کی پکار پر جہاں سہمی ہوئی سبعین الہدیٰ نے سرسیمہ ہو کر اس کی طرف نگاہ کی تھی، وہیں وہاں موجود شاپ کے دیگر ملازمین اور کسٹمرز نے بھی اپنی اپنی توجہ اس کی سمت مبذول کی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں.....؟ اور تم..... تم مجھے بناء انفارم کیسے یہاں کیوں آئی ہو۔“

اس لمحے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اپنے پہلو میں کھڑی سبعین الہدیٰ کا آنسوؤں سے ترچہ اپنے جاندار تھپڑوں سے سرخ کر ڈالے۔ تبھی ایک قہر آلودہ نگاہ اس کے رف سراپے پر ڈالنے کے بعد وہ سیلز مین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”جی مسٹر..... کانسڈلی آپ مجھے بتائیے کہ کیا معاملہ ہے؟“

”آپ کون ہیں؟“ سیلز مین نے الٹا اس پر سوال داغ دیا تھا۔ تب کچھ لمحے کی تاخیر کے بعد اس نے کہا۔

”قریبی عزیز ہوں ان کا، پلیز مجھے بتائیے کہ معاملہ کیا ہے۔“

سبعین الہدیٰ کی نگاہیں اس وقت جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ زمین

پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”دیکھئے محترم، ابھی ایک گھنٹہ قبل یہ محترمہ کچھ گولڈ کی چوڑیاں لے کر ہمارے پاس آئیں، میں نے ہی انہیں دیکھ کر کہا تھا اور ان کی چوڑیوں کی جانچ پرکھ کر کے مطلوبہ رقم بھی انہیں

اس کا مطالبہ بہت عجیب نہیں تھا، لہذا انزلہ شاہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے نازک ہاتھوں میں لے کر ایک عظم سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں سعاد کہ چاہے زندگی کسی بھی رخ پر ہے، انزلہ شاہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھوں سے کبھی الگ نہیں ہوگا۔“

اس کے عہد پر ایک عجیب سا سکون سعاد شاہد کے چہرے پر بکھر گیا اور اس نے پُر سکون ہو کر اپنی پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلی صبح کا سورج نکلا تو زویا خان کی خوبصورت آنکھیں خوابوں کے سحر سے مدہوش ہو رہی تھیں۔ شانزل نے اسے رات ٹھیک بارہ بجے بہت خوبصورت الفاظ میں وش کیا تھا۔ رات دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنی زندگی کی ڈھیر ساری باتیں شیئر کرتے رہے تھے۔

شام میں زویا کی سالگرہ کا فنکشن شانزل کی خواہش پر اسی کے گھر میں منعقد ہوتا تھا۔ لہذا صبح اٹھتے ہی اس نے تقریب کی اریج منٹ کی تیاریاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ عصر کے ٹائم وہ آؤٹ ڈور سرگرمیوں سے فارغ ہو کر، گھر واپس آیا تو زویا کو اس کی سالگرہ پر پیش کرنے کے لیے گفٹ کی یاد آئی۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ مہمانوں کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ پر پل مکر کے نہایت نفیس کام والے ذرتا لہنگا کرتی میں ملبوس، دلکش سی زویا خان بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی شدید تھکن کے باوجود وہ بناء تیار ہوئے بہت محبت سے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اس کے حسن کی تعریف کرتا۔ اس سے ایکسیکوزہ کے گفٹ خریدنے کی نیت سے قریبی مارکیٹ کی طرف چلا آیا۔

ارادہ زویا کے لیے ایک بہت نفیس سا ڈائمنڈ سیٹ خریدنے کا تھا۔ لہذا اس نے شہر کی سب سے بڑی جیولر شاپ کے سامنے گاڑی روک دی۔ زویا نے اسے بمشکل صرف پندرہ منٹ دیئے تھے۔ لہذا آج کے دن کم از کم وہ اسے ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا، سوائپ اپنے آپ میں مگن، گاڑی لاک کر کے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا سیدھا شاپ کے اندر چلا آیا۔ نظر کے سامنے نہایت دیدہ زیب سیٹ پڑے، جگہ گارہے تھے، جب اس نے ایک نفیس سا قدرے قیمتی سیٹ زویا خان کے لیے پسند کر لیا۔ سیٹ پیک کروا کر اس کی مالیت ادا کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا دکان سے باہر نکل رہا تھا، جب اس کی سماعتوں میں مانوس سسکیوں کی صدا گونجی۔

”دیکھئے..... آپ میرا یقین کیوں نہیں کر رہے، میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں

تھادی تھی، ان محترمہ سے قبل میں ایک خاتون کو یہاں گولڈ کا ایک سیٹ پسند کروا رہا تھا۔ وہ خاتون یہاں سے جا چکی تھیں، تب تک سیٹ یہاں تھا۔ ان محترمہ کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا کسٹمر تھا بھی نہیں، میں بتایا جات ادا کر کے سیٹ کی طرف متوجہ ہوا تو سیٹ اپنی جگہ پر نہیں تھا، اب آپ ہی بتائیے، ہم انہیں شک کے دائرے میں نہ لائیں تو کس کو لائیں جب کہ انہیں پیسوں کی اشد ضرورت بھی تھی۔“

اس قدر تذلیل پر سبعین کی آنکھوں سے مسلسل خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کم از کم شانزل کے سامنے اس درجہ ذلیل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر..... تقدیر نے ایک مرتبہ پھر اسی کے احسان کا مقروض کر ڈالا تھا اسے۔

”آئی سی، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایسی گھٹیا حرکت کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ضرور کہیں نہ کہیں کچھ اور وجہ بنی ہوگی، مگر پھر بھی میں آپ کو اس سیٹ کی ڈبل پے منٹ کرنے کو تیار ہوں، جواب میں آپ ان سے ایکسکیوز کیجیے۔“

شانزل کا لہجہ کسی بھی قسم کی رعایت سے خالی تھا۔ تبھی سبعین الہدیٰ نے ایک دم چونک کر تقریباً پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں میں تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے مزید دینا نہیں چاہتی۔“

”شٹ اپ، اس وقت تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی سے چپ چاپ کھڑی رہو، اوکے۔“

قطعی خشک لہجے میں شانزل نے اسے ڈانٹا، تو سبعین کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔ سلازمین خود اس کے الفاظ پر ہکا بکا رہ کر اس کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ شانزل کو جواب میں کچھ کہتا۔ اس کی نگاہ بے ساختہ ہی سائیڈ پر رکھے، گولڈ کے سیٹ کے ادھ کھلے ڈبے پر جا پڑی، جانے کس خیال کے تحت اس نے وہ ڈبا اٹھا کر دیکھا تو اس میں بے ترتیبی سے رکھے دو سیٹ دیکھ کر اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ دکان کے اس حصے میں موجود تمام لوگوں کی نگاہیں اب اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”سس..... سوری، جلدی جلدی میں بے دھیانی سے یہ سب ہو گیا، مجھے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ غلطی سے میں یہ سیٹ دوسرے سیٹ کے ساتھ ڈبے میں رکھ چکا ہوں۔“

سلازمین کے ندامت میں ڈوبے الفاظ نے جہاں سبعین الہدیٰ کو سرخروئی عطا کی تھی، وہیں شانزل علی شاہ کا عتاب گویا آسمانوں کو چھو گیا تھا۔

”واہ..... کیا بات ہے آپ کی.....؟ اتنی دیر سے آپ میری عزیزہ کی تذلیل کر رہے ہیں۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں ان کی پوزیشن اکورڈ کر رہے ہیں، پولیس کے حوالے کر دینے تک کی دھمکیاں دے رہے ہیں، جب کہ غلطی سراسر آپ کی اپنی ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں یہ یہاں اپنی مجبوری کے باعث آئیں تو لاوارث ہیں، ان کے سلسلے میں آپ سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے، میں چاہوں تو ابھی آپ پر ہتک عزت کا دعویٰ کروا کر آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل سکتا ہوں، آئندہ اپنے کسٹمرز کی عزت کا خیال رکھیے گا۔“

قطعی درشت لہجے میں کہنے کے بعد وہ سبعین کا بازو تھام کر، اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ باہر گاڑی کی طرف لایا، پھر خاموشی سے اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر، دوسری طرف سے ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا، سبعین الہدیٰ کو اس وقت اس سے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اندر اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں پا رہی تھی۔ لہذا دونوں ہاتھ خاموشی سے گود میں رکھے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ نہایت ایک شاندار ریسٹ ہاؤس کے سامنے رکی، تو اس کی حیرانگیوں میں مزید اضافہ ہو گیا، تاہم شانزل علی شاہ کے بگڑے تیوروں کے باعث یہاں بھی اس نے فی الحال خاموشی سے کام لیا تھا۔ نتیجتاً شانزل اسے بازو سے تھام کر، ریسپشن پر کھڑے صاحب سے ضروری امور ڈسکس کر کے، اسے اس ریسٹ ہاؤس کی بالائی منزل پر بنے، اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف لے آیا۔

”یہ..... یہ تم کہاں لے آئے ہو مجھے، تمہیں جرات کیسے ہوئی مجھے اس طرح سے یہاں لانے کی.....؟“

سبعین مزید برداشت نہ کر سکی تو بلا آخر چلا اٹھی، جواب میں غصے سے سرخ شانزل علی شاہ کا بھاری ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور اپنی پانچویں انگلیوں کے نشان سبعین الہدیٰ کے شفاف گال پر چھوڑ دیا۔

”کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو، ہاں..... کیا سمجھتی ہو، کوئی دیوی ہو تم، آسمان سے اتری کوئی مخلوق ہو، جو کسی کا احسان لے کر جینا نہیں چاہتی، کیوں ہر قدم پر چوٹ پہنچاتی رہتی ہو مجھے.....؟ رسوا کرتی رہتی ہو.....؟ کیوں میری ہی زندگی کا اختیار مجھ سے چھین لیا ہے تم نے، آخر کیوں؟“

وہ لاوا جو پچھلے کئی برسوں سے اس کے اندر پک رہا تھا، آج بلا آخر پھٹ پڑا تھا۔

”کیا قصور کیا ہے میں نے.....؟ بولو..... ایسی کون سی خطا سرزد ہوئی ہے مجھ سے،“

جو میری سزا ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی مانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا تھا، نادانستگی میں خطا سرزد ہوئی تھی مجھ سے، مگر تم..... تم میری خطا سے بڑھ کر سزا دے چکی ہو مجھے، یقین نہیں آتا تو دیکھو، دیکھو یہ میرا وجود، جو میں نے تمہارے لیے سلگ سلگ کر ذبح کر ڈالا ہے۔“

اونچی آواز میں چلاتے ہوئے اس نے اپنی شرٹ پھاڑ ڈالی تھی، تبھی سبعین اس کے سینے پر جگہ جگہ اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”میں تم سے محبت نہیں کرتا، سنا تم نے، نہیں محبت کرتا میں تم سے، مگر اس کے باوجود تم دھڑکن بن کر میرے سینے میں دھڑکتی ہو، تمہاری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو جگر میرا کتنا ہے، کوئی تمہاری طرف میلی نگاہ سے دیکھتا ہے تو سانس میرے سینے میں الجھنے لگتی ہے، تم میری بے لوث پاکیزہ محبت کے قابل نہیں ہو، مگر پھر بھی، جو چوٹ تمہارے بدن پر لگتی ہے اس کا درد، میں اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہوں، تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے، میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا، سوچنا نہیں چاہتا، مگر پھر بھی، تم ایک بل کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہو، تو میری سانس، میرے سینے میں الجھنے لگتی ہے، مرنے لگتا ہوں میں، حالانکہ جانتا ہوں کہ تم پتھر ہو، مر جاؤں گا میں تم سے ٹکراتے ٹکراتے، مگر پھر بھی باز نہیں آ رہا ہوں میں..... کتنی سنگ دل ہو تم“

سبعین اس کی طرف توجہ بھی نہ کرتی۔ تب بھی اس کی سرخ آنکھوں میں چھلکنے والی نمی، اس کے لہجے میں کھلی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں میں نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا، مگر میرا یقین کرو، میں اپنے اس ایک غلط اقدام پر، ایک لاکھ مرتبہ پچھتا رہا ہوں سبعین، تم مجھے اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتیں، نہ سمجھو، تمہاری نظر میں میں تمہارے شوہر اور حشر و ذیشان وغیرہ کی موت کا ذمہ دار ہوں، ٹھیک ہے تمہارا لگایا ہوا الزام مجھے قبول ہے سبعین، میں خود بھی اپنے آپ سے بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں، لہذا آج میرا یہ آخری اعتراف بھی سن لو، کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے حد بے تحاشہ دیوانگی کی آخری حدوں کو چھوتی ہوئی جنونی محبت، تمہارے سوا اس پوری کائنات میں نہ تو مجھے کوئی دیکھائی دیتا ہے، نہ کسی کی آواز سنائی دیتی ہے، میں سہارے ڈھونڈتا ہوں خود کو مضبوط کرتا ہوں، مگر، تم تک پہنچتے ہی تھک کر گر جاتا ہوں ہار جاتا ہوں۔ یہ اذیت، تمہاری یہ بے بسی و بیگانگی اب مزید مجھ سے برداشت نہیں ہوتی سبعین، لہذا اس سے پہلے کہ میں تمہیں مار ڈالوں۔ میں آج تمہاری آنکھوں کے سامنے خود اپنی زندگی کا چراغ گل کر لیتا ہوں تاکہ تمہیں کم از کم اتنا یقین تو آ جائے کہ میں تمہاری خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ اپنی جان دینے

سے بھی دریغ نہیں کر سکتا۔“ وہ ساکت کھڑی تھی، جب شانزل علی شاہ نے نہایت تھکے ہوئے لہجے میں کہنے کے بعد ایک آخری ملاہتی نگاہ اس پر ڈالی اور اگلے ہی پل قریبی ٹیبل پر پڑی پھل کاٹنے والی تیز دھار چھری اٹھا کر اپنی بائیں کلائی کی رگ کاٹ لی۔ خون کی ایک تیز دھار اچانک پھوٹی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے شانزل علی شاہ کی ساری کلائی سرخ خون میں نہا گئی۔

عین اسی لمحے سبعین الہدی کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی اور اس کے حلق سے ایک فلگ شکاف جھج برآمد ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریسٹ ہاؤس کا سارا عملہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ ارد گرد موجود لوگ سبعین الہدی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ادھر ”شاہ پیلس“ میں پل پل انتظار کرتے ہوئے بے قراری سے نگاہیں دوڑاتی زویا خان کا اضطراب گویا اپنی آخری حد تک جا پہنچا تھا۔ ”شاہ پیلس“ میں سبعین الہدی کی عدم موجودگی اور شانزل کی بے نیازی نے لہجوں میں اسے بکھیر کر ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا، وہ اس کی سالگرہ کے اتنے اہم موقع پر بھی سبعین کو اس پر فوقیت دیے جانے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تبھی دل کے اندر جیسے آنسوؤں کا سیلاب جمع ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنی سالگرہ کی ہی تقریب اسے اپنی موت سے بھی زیادہ کرب انگیز محسوس ہو رہی تھی۔ لوگوں کی زبان پر قصاں شانزل اور سبعین کے تذکرے اسے اندر ہی اندر سے مسار کر رہے تھے۔ آج اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا، تو وہاں شیشے کے اندر اس کا اپنا عکس نہیں تھا۔ وہاں اس کے روپ میں اس کی اپنی ماں کھڑی تھی۔ لٹی پٹی ٹھکن سے بے حال، خالی دل لیے تبھی قیامت خیز لمحوں کا درد ایک ایک پل میں کسی نشتر کی مانند اپنے جگر پر پہننے کے بعد تقریب کے ختم ہوتے ہی وہ اپنے گھر واپس لوٹ آئی تھی کس اعلا نہیں۔ کاتھا اور اس نے بہت خاموشی کے ساتھ، چپ چاپ خود کو ابیدی نیند کے سپرد کر ڈالا۔

☆☆☆

سارا گاؤں ”دہشت“ کی علامت سنی دادا سے نفرت کرتا تھا اس کے نام پر سہم کسل خواتین دیواروں سے چپک جایا کرتی تھیں، مگر اسی ”سنی دادا“ کو انزلہ شاہ نے اپنی محبت سے پھر سے ایک مہذب انسان کی جون میں واپس لوٹا دیا تھا۔

پورے گاؤں میں گویا ایک تہلکہ مچ کر رہ گیا تھا۔ ہر انسان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے والا سحان شاہ اب ایک نہایت شریف پڑھے لکھے نوجوان کی حیثیت سے سبھی گاؤں والوں کا احترام کرنے لگا تھا۔ اب گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو وہ بہن کے بغیر نہیں پکارتا تھا۔ انزلہ شاہ کے ساتھ مل کر اس نے

شہر آئے ہوئے تھے کہ آنا فانا ہی آسمان گھنگور بادلوں کی زد میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ تیز تیز چل کر گاؤں پہنچتے تیز بارش زمین پر نازل ہو چکی تھی۔

”اوگاڈا، اس بارش کو بھی ابھی برساتا تھا“

اوپر برستے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے انزلہ نے قدرے جھنجھلا کر کہا تھا، جب سمعان دھیمے سے مسکرا کر بولا۔

”تم تو بارشوں کی رسیا تھیں انزلہ، پھر اب یہ بیزاری کیوں؟“

”جناب میں اب بھی بارشوں کی رسیا ہوں، مگر اس وقت ہم روہنٹس نہیں کر رہے کام کر رہے ہیں جو اس بارش کی آمد سے رک گیا ہے۔“ انزلہ کے دو بدولچے کے جواب میں وہ خا صا دل کھول کر ہنسا تھا۔

”پتہ ہے انزلہ کل میں نے ایک بہت خوبصورت خواب دیکھا ہے۔“

”کیسا خواب۔“ اس نے فورا چونک کر پوچھا تھا۔

”بہت حسین خواب تھا، تم ہوتی ہو، میں ہوتا ہوں، بڑی ماں ہوتی ہیں اور ہمارے چھوٹے چھوٹے پیارے بچے تم صبح کا ناشتہ تیار کر رہی ہوتی ہو، میں صحن میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں اور بڑی ماں ہمارے بچوں کو اپنے ارد گرد بٹھا کر انہیں بڑی اچھی اچھی باتیں بتا رہی ہوتی ہیں، میں اخبار کی اوٹ سے چوری چوری تمہیں کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوتا ہوں، جب تم اچانک کچن سے نکل کر میرے پاس آتی ہو اور دھاڑ کر کہتی ہو۔“

”تم یہاں مزے سے بیٹھے اخبار چاٹ رہے ہو اور میں وہاں کچن میں کھڑی کب سے چینی کے لیے خوار ہو رہی ہوں، بچوں نے سکول جانا ہے ناشتہ کب تیار کروں گی میں ہائے..... میری تو قسمت ہی خراب تھی جو تم جیسے مرد سے پالا پڑ گیا میرا.....“

وہ اسے اپنا خواب سنا رہا تھا اور انزلہ اس کے انداز پر دل کھول کر ہنس رہی تھی، جب وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”ایسے مت ہنسا کرو انزلہ، تمہیں کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے، ویسے کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے کس سے.....؟“ انزلہ شاہ نے فورا انہی کو بریک لگا کر پوچھا تھا۔ جب اس نے یاسیت سے کہا۔

”خود اپنے آپ سے اپنی تقدیر سے اپنے ہاتھوں کی بے رحم لکیروں سے..... انزلہ..... کہیں.....“

گاؤں سے پرائمری سکول کے لیے چندہ جمع کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ دونوں خدمت خلق میں بے حد مصروف ہو کر رہ گئے تھے۔ اس موقع پر انزلہ شاہ نے نہ صرف بیک میں جمع اپنے اکاؤنٹ سے کام لیا تھا بلکہ ایک درخواست حکومت کو بھی دی تھی کہ وہ فلاں گاؤں میں ضروریات زندگی کی ضروری سہولیات مہیا کرنے کے سلسلے میں ان کی مدد کرے۔

گاؤں والوں کے لیے میٹھے پانی کے پینڈ پمپ لگوانے بجلی اور ٹیلی فون کے کنکشن بحال کروانے میں سمعان شاہد نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ گاؤں میں موجود ٹوٹے پھوٹے ہسپتال کی مرمت اور وہاں ضروری ادویات و متعدد ڈاکٹرز کی موجودگی بھی انہی دونوں کی باقاعدہ کوششوں سے وجود میں آئی تھی۔ گاؤں کی کچی سڑکیں پکی بننے لگی تھیں اگلے چند ہی مہینوں میں گویا ایک انقلاب در آیا تھا وہاں گاؤں والوں کے لب اب انہیں دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔

حکومت نے ان کی درخواست پر تاخیر سے ہی سہی، مگر ایک اچھے سکول کی تعمیر کے لیے بھاری گرانٹ کا اجراء کر دیا تھا۔ سمعان اور انزلہ نے یہ سکول اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا۔ سکول کی عمارت تکمیل کے مراحل میں پہنچی تو انزلہ نے گھر گھر جا کر، گاؤں کے بچوں کو سکول میں داخل کرنے کا کام شروع کر دیا۔ سکول میں بچوں کو سلیپس کی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ انہیں دینی معاملات سے متعلق بھی آگاہی دیتی تھی۔ حضور اور ان کے پیارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ کی زندگیوں پر مبنی واقعات سنایا کرتی تھی۔ ننھے ننھے معصوم ذہنوں میں علم و فلاح کی باتیں اتار کر جو راحت وہ محسوس کرتی تھی، کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

ادھر سمعان کھیتوں میں مسلسل ان پڑھ مزارعوں کو عمدہ بیجوں کھادوں اور کھیتی باڑی سے متعلق دیگر مفید امور کے متعلق مسلسل ڈکٹیشن دیتا رہتا تھا۔ نتیجتاً اس بار تمام گاؤں والوں کی فصلیں بے حد شاندار ہوئیں تھیں انزلہ شاہ کے ساتھ مل کر کئی بار وہ ایلان شاہ کی قبر پر بھی گیا تھا۔ اس کی لہد پر فاتحہ خوانی کے بعد اس کی مغفرت کی بہت سی دعائیں بھی مانگی تھیں بہت بار ایسا بھی ہوا کہ وہ کھیتوں میں کام میں مصروف ہوتا اور انزلہ اس کے لیے کھانا لے آتی۔

تب دونوں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھاتے، زندگی سمعان شاہد کے لیے ایک دم سے بہت حسین ہو کر رہ گئی تھی۔ انزلہ نے اپنی ذہانت و فراست کا استعمال کرتے ہوئے ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں کے دماغ بھی کسی حد تک درست کر ڈالے تھے۔ خود اس کی اپنی دادی اور سمعان کی بڑی ماں ان دونوں کو دعائیں دیتی نہیں تھکتی تھیں۔

”گاؤں کے ہی کسی ضروری کام کے سلسلے میں گاؤں سے ایک ساتھ.....“

تھے سرسبز کھیتوں کے قریب درخت کے نیچے کسی کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ بلند آواز میں بین کر رہا تھا۔ کسی کی بے قرار نگاہیں، پل پل اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ مگر وہ مسہار ہو چکی تھی۔ دل کا درد دل کے اندر ہی گھٹ کر رہ گیا تھا۔ اپنے اندر کی انزلہ شاہ کو مار کر اس نے مسٹر عماد شاہ کا خول خود پر چڑھا لیا تھا۔ پورے تین ماہ ہو گئے تھے، وہ پلٹ کر گاؤں واپس نہیں گئی تھی۔ اس روز دادی ماں نے گاؤں واپسی کی تیاری کی تو اس کے ضبط کی طنائیں بھی چنچ گئیں اور وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”دادی ماں..... دادی ماں مجھ سے یہ درد برداشت نہیں ہو رہا..... میں نے اس سے عہد کیا تھا، زندگی بھر ساتھ نبھانے کا، ہر دکھ سکھ میں قدم با قدم ساتھ ساتھ چلنے کا، مگر..... وہ اکیلا ہو گیا ہے دادی ماں..... میں نے اکیلا چھوڑ دیا ہے، وہ..... وہ پھر سے بھٹک جائے گا دادی ماں، وہ خود کو نقصان پہنچا لے گا، مر جائے گا میرا سہان شاہد.....“

کرسی کا پایہ پکڑ کر بھٹکتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی، جب دادی ماں نے خفگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے بری طرح سے ڈانٹ دیا۔

”چپ کر بیوقوف لڑکی، وہ غنڈا اموالی لڑکا تیرے قابل نہیں تھا۔ بُرائی جس کی گھٹی میں پڑی ہوں، وہ لاکھ اچھائی کے درس پڑھ لے اچھا نہیں ہو سکتا، تیرے ساتھ مل کر اس نے بھلے اچھے کام کیے ہوں، مگر وہ تجھے عماد سے زیادہ خوش نہیں رکھ سکتا تھا، ویسے بھی تجھے کسی کی زندگی سے زیادہ اپنی زندگی کی خوشیوں کی پرواہ کرنی چاہیے، جو جس کے نصیب میں ہوتا ہے وہی اسے ملتا ہے، تو بھی اسے بھول جا خبردار جو آئندہ اس کا نام بھی تیری زبان پر آیا تو..... بہو ویسے ہی دل کی مریضہ ہے اس کا سوچ اور اپنے میاں کو خوش رکھ سبھی.....“

ان کی ہدایت کے عین مطابق انزلہ شاہ نے وقت کے ساتھ ساتھ سہان شاہ کو بھلا کر اپنی تمام تر توجہ اپنی زندگی پر مرکوز کر دی تھی، مگر محبت کی دلدل میں دھنسا سہان علی شاہ نجانبے کتنے سالوں تک نہر کے کنارے لگے درخت کے نیچے بھری دو پہروں میں بیٹھ بیٹھ کر اس کی واپسی کی راہ کو دیکھتا رہا۔ اپنے حلیے سے، کھانے پینے سے یکسر بے نیاز ہو کر وہ ہر پل ہر لمحے محض انزلہ شاہ کے نام کی تسبیح پڑھتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔

سخت گرمی اور شدید بارش میں بھی وہ ٹاہلی کے نیچے بیٹھا ایک ٹک سیدھی پگڈنڈی کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ گاؤں والے اب اس کے حال پر ترس کھانے لگے تھے۔ ایک روز وہ بخار کی لپیٹ میں آیا تو پھر بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ آخر کار ایک روز وہ ٹاہلی کے درخت کے نیچے

اضطراب چھلکاتی نگاہوں میں اس وقت بہت عجیب سا حزن بکھرتا دیکھائی دے رہا تھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے جواب میں کچھ کہتی۔ اچانک اس کے پاؤں میں کوئی ٹوکیلا کا ٹٹا شدت سے چبھا اور وہ سہان کا ہاتھ تمام کر سکا رہی بھر کر رہ گئی۔

”اوگاڈ..... ایک تو اس گاؤں کے خار تمہیں راس نہیں ہیں، میرا بس چلے تو ان کا نٹوں کو آگ لگا ڈالوں جو میری انزلہ کے پاؤں میں چبھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کا پاؤں تھامتے ہوئے نوکیلے کانٹے

اس لمحے وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کا پاؤں تھامتے ہوئے نوکیلے کانٹے کو باہر نکال چکا تھا۔ انزلہ شاہ اس لمحے اس کے الفاظ پر گویا ٹار ہو کر رہ گئی تھی۔

زندگی کی طویل راہ گزر پر وہ قدم با قدم اس کیساتھ چلنے کی خواہش مند تھی، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر زندگی کے ہر مصائب کا مردانگی سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی، مگر..... اس معاملے میں اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ جو اپنے حوصلے اپنی ذہانت سے پتھروں کو موم کرنے کا سلیقہ رکھتی تھی، اپنی زندگی کی خوشیوں کے لیے محض ایک کوشش بھی نہیں کر سکی۔ ہاتھ سے سہان علی شاہ کا ہاتھ کیا گیا۔ اسے جینے کے رموز ہی بھول گئے۔ درد کو مردانگی سے سہنے کا درس دینے والی وہ مضبوط لڑکی، اپنی محبت کی بساط پر محض ایک ہی درد کے جھٹکے سے بھر بھری ریت کی مانند ڈھس کر رہ گئی تھی۔

اس کی مہاج کی ادائیگی کے بعد پاکستان واپس آئیں تو ان کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ایسے میں انزلہ کو دل پر جبر کر کے سہان کے ساتھ محبت نبھانے کے عہد و بیان کر کے شہر واپس جانا پڑا تھا۔ مگر یہاں تقدیر اس کی روح پر کیسا کاری وار لگانے کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی، اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔ اسے شہر میں واپس آئے تیسرا دن تھا جب ایک روز اچانک شام میں اس کی مہاج کی طبیعت پھر سے خاصی خراب ہو گئی۔ تب ان کی خواہش و ہدایت کے عین مطابق فوراً سیمین کے نکاح کی تیاری عمل میں آ گئی تھی۔ دل کی داستان سنانے کا موقع نصیب ہو سکا نہ برباد محبت کے آخری آنسو بہانے کا اعزاز..... اور وہ چکا بکا سی محض چند لمحوں میں انزلہ شاہ سے مسٹر عماد شاہ ہو کر رہ گئی۔ عماد اس کے بھائی احسن شاہ کا سابقہ کلاس فیلو اور اب بزنس پارٹنر تھا۔ سالوں سے اس گھر میں اس کا آنا جانا تھا۔ اچھے لڑکوں والی تمام خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مگر..... انزلہ شاہ کا شہر دل برباد ہو گیا۔ محض چند لمحوں میں اس کی محبت لٹ گئی۔

سبھی مسرور تھے دادا جی، دادی جی، اس کی مہاج، اس کا بھائی خود عماد شاہ بھی، مگر..... اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں اسے اپنے بیان رلتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے

بیٹا بالآخر زندگی کی بازی ہار گیا۔

بہت سالوں کے بعد زندگی نے انزلہ شاہ کو اس گاؤں میں آنے کی مہلت دی تو اس کا آدھا سر چاندی کے بالوں سے سفید ہو چکا تھا۔ اس کے دادا جی دادی ماں شوہر اور ماں سب ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ صرف ایک بیٹی خدا نے دی تھی اور وہ آج اسی بیٹی کی فرمائش پر بہت شرمساری اس گاؤں میں آئی تھی۔ جہاں کبھی اس نے کسی سے محبت کے عہد و پیمان کیے تھے۔

گزری ہوئی زندگی کے پچھلے انیس سالوں میں اس نے کسی سے سنعان شاہد کا حال نہیں پوچھا تھا۔ اتنی ہمت ہی نہیں تھی اس میں کہ کبھی آکر اس کا سامنا کرتی، اس کی پرشکوہ نگاہوں میں دیکھتی، جب بھی گزرے ہوئے کل کی کسی یادگار کا بھولا بھٹکا خیال اس کے تصور میں آتا تھا۔ وہ نئے نئے سرے سے ادھڑنے لگی تھی۔ پچھلے انیس سالوں میں اس نے زندگی کو کسی زہر کی مانند، گھونٹ گھونٹ پیا تھا، نہ کبھی خود خوش رہ سکی تھی اور نہ ہی اس سے وابستہ افراد کو اس کے وجود سے کوئی راحت مل سکی تھی، عجیب پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی وہ اکثر راتوں کو اٹھ کر زور زور سے چلانے لگتی تھی۔ انیس سالوں کے بعد اس کی نگاہوں نے پھر سے اپنے من پسند چہرے کو تلاشا تھا۔ سرتاپہ بدلے گاؤں کی پکی گلیوں میں بے مقصد پھرتے ہوئے اس نے چاپ چاپ سنعان شاہد کو صدائیں دی تھیں۔ مگر اس کی کسی صدا کا کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور تب گاؤں میں ہی کسی سے اس پر حقیقت کھلی تھی۔

سنعان علی شاہد کی کرہنک موت کی حقیقت اس کی برباد محبت کی حقیقت ایک مرتبہ پھر وہ سمار ہوئی تھی انیس سالوں کے بعد اس کی آنکھوں نے پھر سے بے دریغ آنسو لٹائے تھے۔ نہر کے قریب ٹاہلی کے درخت پر سنعان شاہد کی تحریر اس کی سانسیں الجھا رہی تھی۔

”تم نے واپس لوٹنے کا وعدہ کیا تھا اور تم وعدہ خلاف نہیں ہو۔“

اس کا دل دھڑکنے بند ہو چکا تھا۔ لرزتے ہاتھ پاؤں جیسے لمحوں میں برف ہو گئے تھے۔ جانے کس ضبط کے عالم میں وہ ایلان شاہ کی قبر پر پھول رکھنے کے بعد ”شہر خاموشاں“ میں بے اپنے سنعان علی شاہد کی آخری آرام گاہ تک آئی تھی۔

”ما..... آپ روکیوں رہی ہیں۔ آخر کس کی قبر ہے یہ.....؟“

اس کی جوان سالہ بیٹی نے قدرے الجھ کر اس کی برقی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ جب اس نے خود سے بے نیاز خاصے بکھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ ایک ایسے شخص کی قبر ہے بیٹے، جو ساری دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا تھا، سب

اس سے ڈرتے تھے، خوف کھاتے تھے، بار بار اسے جان سے مارنے کی کوشش کی گئی، مگر زندگی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا، بڑے سے بڑا دکھ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا، مگر..... وہ ایک عہد کی بدعہدی میں جان سے گزر گیا، کسی کے لوٹ آنے کا انتظار کرتے کرتے خود پتھر کا ہو گیا جسے زمانے بھر کی نفرت نہیں مار سکی، وہ محض ایک عام سی لڑکی کی محبت میں مر گیا۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو اس کی بیٹی کے لیے اسے سنبھالنا خاصا دشوار ہو گیا۔

”سنعان..... سنعان مجھے معاف کر دو، اپنی انزلہ شاہ کو معاف کر دو سنعان، میں نے تمہارے پاس لوٹ آنے میں بہت دیر کر دی، خدا کے لیے اٹھو سنعان، مجھ سے بات کرو، میری دنیا میں واپس آؤ، دیکھو میں لوٹ آئی ہوں تمہاری انزلہ شاہ واپس لوٹ آئی ہے۔ اسے دیکھو سنعان اس سے بات کرو تمہاری بے لوث محبت کی قسم تمہارے حسین خوابوں کی قسم، میری دنیا میں واپس لوٹ کر آؤ سنعان خدا کے لیے میری زندگی میں واپس لوٹ کر آؤ۔“

چلاتے چلاتے اس کی آواز گھٹنے لگی تھی ارد گرد کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، مگر وہ خود پر ضبط نہ کر سکی۔

”آکر دیکھو سنعان آج اس گاؤں میں کہیں کسی چوہدری کا نام و نشان نہیں ہے ہمارے گاؤں کے کبھی بچے پڑھ کر باشعور زندگی گزار رہے ہیں اب کہیں کسی سنی دادا کو اپنے دوست گاؤں کے چوراہے پر روتے ہوئے نظر نہیں آتے، کہیں کسی کی سسکیاں نہیں گونجتیں۔ اپنے لہو سے جو دیپ تم نے جلایا تھا، اس دیپ سے یہ پورا گاؤں منور ہو چکا ہے سنعان، پچھلے انیس سالوں میں اس گاؤں کا کوئی نوجوان جھوٹے پولیس مقابلے میں نہیں مرا، آکر دیکھو ناں، سنعان مجھ سے گلہ تو کرو، میری بے بسی کی داستان تو سنو سنعان تمہیں خدا کا واسطہ۔“

چلاتے چلاتے وہ بے ہوش ہو چکی تھی، مگر اس کی صدائیں سنعان علی شاہد کی سماعتوں تک نہیں پہنچیں۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر، کدھر سے آیا کدھر گیا وہ عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں، میرے تو دل میں اتر گیا وہ، وہ صبح کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اگلے کچھ روز میں انزلہ شاہ کی حالت سنبھل چکی تھی، مگر ایک جلد چپ نے مستقل اس کے لبوں پر پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ دل کا ناسور اب رسنے لگا تھا، لہذا وہ ایک مرتبہ پھر اپنی

تمہارے پاس۔“

”نہیں..... جب تک تم میرے پاس پہنچو گے میں زندگی کا ساتھ چھوڑ جاؤں گی شان، بب..... بس مرنے سے پہلے آخری بار تم سے یہ اعتراف سننا چاہتی ہوں کہ تم سبعین سے محبت کرتے ہو۔“

”وہاٹ ریش زویا..... تہمت تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا، میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔“ کہنے کے ساتھ ہی اٹنے پاؤں واپس دوڑ گیا۔ وسیع روڈ پر اس کی گاڑی نہایت تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ ذہن میں جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اعصاب ایک دم سن ہو کر رہ گئے تھے۔ برستی آنکھوں اور منتشر دماغ کے ساتھ جب وہ اس کے پاس پہنچا واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ زویا خان کی آنکھیں اسے بناء دیکھے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

خواب آور گولیوں کی بھاری تعداد نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ زویا کی ماما پناکل اثاٹھ لٹ جانے پر بلک بلک کر رو رہی تھیں، جب کہ وہ ساکت کھڑا اس کے کمرے کی دہلیز سے لگا۔ قطعی بے یقینی کے عالم میں اس کے فرش پر پڑے مردہ وجود کو دیکھ رہا تھا۔ آج اسے خود پر غصہ آ رہا تھا، ندامت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے سبعین الہدیٰ کی بجائے زویا خان جیسی پیاری لڑکی سے محبت کیوں نہ کی؟

زویا خان کی مٹھی میں انگریجٹ کی وہ رنگ مقید تھی جو شانزل نے اسے منگنی کے فنکشن میں خود اپنے ہاتھوں سے پہنائی تھی۔ آج اس نے شانزل علی شاہ سے جڑا، گویا ہر رشتہ خود توڑ دیا تھا۔ بہت سادقت چپ چاپ بیت گیا، مگر وہ زندگی کا احساس وجود میں بیدار نہ ہو سکا۔ کسی بھی طرح سے اسے زویا خان کی ناگہانی محبت کا یقین نہیں آتا تھا۔ محض تھوڑے ہی عرصے میں اس نے خود کو تباہ کر لیا تھا۔ سگریٹ کے ساتھ ساتھ اب اس نے شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی۔ سبعین جو آل ریڈی اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اب اس کی حالت دیکھ کر چپختار ہی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ شدید بخار میں مبتلا تھا۔ معطر اس کی خوب تیار داری کر رہی تھی، مگر اس کی حالت تھی کہ سنبھل کر ہی نہ دے رہی تھی، تب سارے قوائد و ضوابط کو سائیڈ پر رکھ کر وہ مزید برداشت نہ کرتے ہوئے اس کے کمرے میں چلی آئی، جو دونوں آنکھوں پر بازور کھے لیٹا تھا۔ سبعین بنا چا پ پیدا کیے اس کے بیڈ تک آئی اور اپنا چہرہ اس کے پاؤں پر رکھ کر سک پڑی۔ شانزل نے لمحے سے قبل آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”تہمت..... تم..... یہاں.....؟“

سانسوں کی مہک گاؤں کی ان گلیوں میں چھوڑ کر شہر واپس چلی آئی تھی۔ کچھ سال مزید خاموشی سے بسر ہو گئے تو اس نے اپنی بیٹی کی بھی شادی کر دی۔

زندگی اب اس کے اندر جیسے تھکنے لگی تھی روز کھانتے کھانتے وہ اب خون اگلنے لگی تھی۔ لہذا ایک مرتبہ پھر گاؤں چلی آئی۔ اس کی زندگی کا معمول محض سنعان علی شاہ کے ساتھ گزرے دنوں کی یاد کا پیچھا کرنا تھا اور یونہی اس کی یاد کا پیچھا کرتے کرتے ایک روز وہ خود بھی محبت کی کہانی کو امر کرتے ہوئے ”شہر خاموشاں“ میں چپ چاپ اس کے پہلو میں جاسوئی۔ مگر اس گاؤں کے لوگ آج بھی ان دونوں کی محبت کی کہانی کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

☆☆☆

عشق نما ناں اڑ پھڑ جانا، ربا لگ ناں کسے نوں جاوے لکھ گلیاں تھیں کر دینا اتے در در بھیک منگاوے شانزل علی کلینک سے بینڈج کروا کر گھر آیا تو عین اسی لمحے اس کے موبائل کی بزرنگ اٹھی۔ ابھی ابھی اس نے موبائل آن کیا تھا اور کال آگئی تھی، سکرین پر زویا خان کا نمبر دیکھ کر وہ شدید ندامت میں گڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کی از حد ناراضگی کا احساس اسے بے کل کر رہا تھا، تبھی اس نے بہت پیار سے پہلو کہا، تو دوسری طرف زویا خان کی سسکاری نکل گئی۔

”زویا..... زویا کہاں ہو تم..... زویا..... زویا تم روکیوں رہی ہو۔“

اس کے پہلو میں کھڑی سبعین الہدیٰ نے پہلی بار زویا خان کے لیے اس کے لہجے میں درجہ بے قراری دیکھی تھی۔

”مم..... مجھے معاف کر دینا شان..... مم..... میں جانتی ہوں کہ میں آپ کے لیے جان بھی دے دوں، تب بھی آپ کے دل میں سبعین کا مقام نہیں پاسکتی۔ میں نے بہت ضبط کیا ہے بہت سنبھالا ہے خود کو، مم..... مگر آج میں ہار گئی ہوں شان..... کیا کروں، ایک عورت ہوں ناں، مزید برداشت کا یارا نہیں ہے مجھ میں کچھ لوگ شاید ایسی ہی تقدیر لکھوا کر لاتے ہیں آج میں اپنی ماما کے دکھ کو دل سے محسوس کر رہی ہوں شانزل۔“

اس کا لہجہ بہک رہا تھا۔ الفاظ کی ترتیب بھی گبڑ رہی تھی۔ تبھی شانزل علی شاہ کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔

”زویا..... زویا تم کیا کہہ رہی ہو، آئی ایم سوری زویا، مم..... میں آرہا ہوں

”ہاں..... کیوں کہ میں اب مزید ضبط کا یا را نہیں رکھ پا رہی شانزل، اپنی اپنی زندگی کی بساط پر آبلہ پا چلتے ہوئے اب ہم دونوں کے حوصلے ہی جواب دے چکے تھے، خدا شاہد ہے کہ میرے دل میں اب آپ کے لیے ایک ہلکی سی بدگمانی کا احساس بھی نہیں رہا ہے، میں خود سے لڑتے لڑتے تھک چکی ہوں شانزل بکھر کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں میں، خدا کے لیے مجھے سمیٹ لو شانزل مجھے معاف کر دو پلیز.....“

”بس..... اتنی سی بات کہنے میں اتنے سال لگا دیے سبعین۔“ شانزل کے سوال پر اس نے ایک مرتبہ پھر چونک کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ میں اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی تم سے کبھی نفرت نہیں کر پایا سبعین مگر..... تم..... تم پلٹ کر میری طرف آئیں بھی تو اس وقت کہ جب میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ بھی نہیں رہا۔“

آواز کے ساتھ ساتھ اس کی پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔

”ایسا مت کہو شانزل اب بھی کچھ لمحے ہماری گرفت میں ہیں، میرا یقین کیجیے، میں آپ کے اس سونے گھر میں پھر سے زندگی کا احساس بکھیر دوں گی، بہت پیار کروں گی آپ سے ہر دکھ کا کاٹنا آپ کے دل سے نکال دوں گی، بس..... بس خود کو میرے سپرد کر دیجیے، پلیز۔“

اب کے اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تو شانزل کا دل جیسے پھر سے چل کر رہ گیا۔ خوش و غم کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو کر، اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں تو سبعین لپک کر اس کے کشادہ سینے سے آگئی۔

”مجھ سے اب کبھی دور مت جانا سبعین ورنہ میں مرجاؤں گا۔“

”آپ کے سوا اب میری کوئی اور پناہ گاہ ہے ہی کہاں شانزل اب تو یہ دل بھی میرا اپنا نہیں رہا، پھر کہاں جاؤں گی آپ کو چھوڑ کر۔“

”تھینکس۔“

اسے کسی انمول اثاثے کی مانند اپنی بانہوں میں سنبھالے اس نے بہت اطمینان سے کہا اور پھر آنے والے خوشگوار دنوں کے متعلق سوچ کر بھیگی پلکوں سمیت دھیمے سے مسکرا دیا۔

